منافقت

اور

اُس کی علامات

منہاجُ القرآن پبلیکیشنز
365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 042-111-140-140
یوسف مارکیٹ،غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 042-7237695
www.Minhaj.org - sales@Minhaj.org

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش
www.MinhajBooks.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔۱) ۴-۱-۴ / ۸۰ پی آئی وی، مؤرّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ جنرل وایم ۴ / ۹۷۰-۳-۷، مؤرّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱-۶۷ این۔۱ / اے ڈی (لائبریری)، مؤرّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت / اِنتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱ / ۹۲، مؤرّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاج القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	:	منافقت اور اُس کی علامات	
خطاب	:	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	
ترتیب و تدوین	:	رانا جاوید القادری	
تخریج و پروف ریڈنگ	:	محمد ضیاء الحق رازی	
زیرِ اہتمام	:	فریدِ ملّتؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ	Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور	
اِشاعتِ اوّل	:	مئی 1984ء	
اِشاعتِ دُوُم	:	فروری 1986ء	
اِشاعتِ سوُم	:	فروری 1987ء	
اِشاعتِ چہارُم	:	دسمبر 1987ء	(3,000)
اِشاعتِ پنجم	:	اپریل 1997ء	(2,000)
اِشاعتِ ششم	:	مئی 2002ء	(1,100)
اِشاعتِ ہفتم	:	نومبر 2002ء	(1,100)
اِشاعتِ ہشتم	:	اگست 2007ء	(1,100)
قیمت	:	-/45 روپے	

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے آڈیو/ ویڈیو کیسٹس، CDs اور DVDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے **تحریکِ منہاج القرآن** کے لیے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلی کیشنز)

sales@minhaj.org

فہرس

صفحہ	مشتملات
۹	پیش لفظ
۱۲	منافقین کی اَقسام
۱۶	مختصر تاریخی پس منظر
۱۷	دعویٰ ایمان صرف زبانی حد تک کرنا اور باطن کا اُس کی تصدیق سے خالی ہونا
۱۸	محض توحید و آخرت پر ایمان کو کافی سمجھنا اور رسالتِ محمدی پر ایمان اس قدر ضروری نہ سمجھنا
۱۹	دھوکہ دہی کی نفسیات
۲۳	قلب و باطن کا بیمار ہونا
۲۵	جھوٹ علامت نفاق ہے
۲۵	لفظ عذاب کی لغوی تحقیق
۲۶	نام نہاد اِصلاح کے پردے میں فساد انگیزی
۲۹	دوسروں کو بے وقوف اور صرف خود کو اہل عقل و دانش سمجھنا

مشتملات	صفحہ
السفھاء کا معنی	۲۹
اُمتِ مسلمہ کے اکثر افراد کو گمراہ تصور کرنا منافقانہ سوچ ہے	۳۲
کَمَا اٰمَنَ النَّاسُ سے اِجماعِ اُمت کے وجوب پر اِستدلال اور منافقین کا اِس سے گریز	۳۶
کردار کا دوغلا پن اور ظاہر و باطن کا تضاد	۳۸
خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ کا مفہوم	۳۹
سازشی منصوبہ بندی منافقت کا بڑا گھناؤنا روپ ہے	۴۰
سازشی سرغنے قرآنی اصطلاح میں شیطان ہیں	۴۱
تمسخر اور استہزاء کی نفسیات	۴۱
اللہ کا استہزاء منافقوں کو ذلت و رسوائی کی سزا دینا ہے	۴۲
سزائے فعل کا ذکر اسی فعل سے کرنا اسلوبِ قرآن ہے	۴۳
بعض منصوبوں کا کچھ دیر تک قائم رہنا ان کے حق ہونے کی دلیل نہیں	۴۶
طغان کا مفہوم	۴۷
یعمھون کا مفہوم	۴۷
اشتراء، اشتروا کا مفہوم	۴۸

مشتملات	صفحہ
منافقت سراسر گھاٹے کا سودا ہے	۵۰
ایک گروہِ منافقین کی مثال	۵۱
دوسرے گروہِ منافقین کی مثال	۵۳
قدیر کا مفہوم	۵۷
خلاصہ بحث	۵۸
مآخذ ومراجع	۶۱

www.MinhajBooks.com

پیش لفظ

چراغِ مصطفوی ﷺ سے ستیزہ کار شرارِ بولہبی مختلف اَدوار میں اپنے ناپاک مقاصد کے حصول اور باطل مفادات کے تحفظ کی خاطر مخالفت و مزاحمتِ حق کی مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا ہے لیکن اس کی ایک صورت - جو ہر دور میں جہدِ باطل میں یکساں طور پر کارفرما نظر آتی ہے - ''منافقت'' ہے۔

منافقت ایسے طرزِ عمل کو کہتے ہیں جو قول و فعل کے تضاد سے عبارت ہو، جس میں انسان کا ظاہر باطن سے مختلف بلکہ برعکس ہو۔ ہر دور کے مفاد پرست اَفراد حق کی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار ہوتا دیکھ کر ظاہراً اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور در پردہ اپنے باطل نظریات پر کاربند رہتے ہیں اور اس طرح حق و باطل کے ہر دو طبقات سے وابستگی کا اظہار کر کے اپنے مزعومہ مفادات کا تحفظ اور ناپاک عزائم کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اہلِ یہود کے عزائم خاک میں مل گئے، جو مدینہ میں ایک بالادست سیاسی، اقتصادی اور سماجی طبقے کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے اور جن کے ایک نام ور رئیس عبداللہ بن اُبی کی رسمِ تاج پوشی ادا ہونے والی تھی۔ اسلام کی شوکت و رفعت اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذاتی وجاہت و عظمت سے مرعوب ہو کر یہ لوگ اسلام کی کھل کر مخالفت نہ کر سکے۔ البتہ ان میں سے بعض بظاہر دائرہ اسلام میں داخل ہو کر غلبہ حق کی اس عالمگیر تحریک کو گزند پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔

حضور نبی اکرم ﷺ اُن کی باطنی کیفیت سے آگاہ تھے تاہم بعض مصلحتوں کی بنا پر ابتداءً اُن کے خلاف کسی قولی یا عملی کارروائی سے اِعتراض فرماتے رہے۔ تاہم رب

العزت نے ان لوگوں کے اندازِ فکر وطرزِ عمل اور فتنہ پرداز ذہنیت کو شرح و بسط کے ساتھ اہل ایمان کے سامنے رکھ دیا تا کہ وہ ان کی محض ذہنیت، قول وعمل کے تضاد اور مذموم عزائم سے باخبر رہیں اور اس طرح ان کی معاندانہ سرگرمیوں کا سدباب کیا جاسکے۔ قرآن حکیم سے منافقت کے دو بنیادی روپ سامنے آتے ہیں:

۱۔ اعتقادی منافقت ۲۔ عملی منافقت

منافقت کی پہلی قسم کا تعلق حضور نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک کے ساتھ خاص تھا جب کہ اس کی دوسری قسم آج بھی کئی صورتوں میں اسلامی معاشرے میں موجود ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو قول وفعل کے تضاد کا شکار ہیں۔ جن کا ظاہر بڑا دل آویز نظر آتا ہے لیکن باطن نفاق کی دبیز تاریکیوں سے تیرہ و تار ہے۔ قرآنِ مجید جب بھی منافقت کی علامات کا ذکر کرتا ہے تو اس کی گونا گوں جلی و خفی اَنواع جن کے بارے میں عام ذہن نفاق کا گمان بھی نہیں کرسکتا، ہمارے سامنے واضح طور پر آجاتی ہیں۔

یہ مختصر کتاب شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے اُن ابتدائی دروسِ قرآن کا مرتبہ مجموعہ ہے جو آپ نے سورہ بقرہ کے دوسرے رکوع پر شادمان میں دیے۔ ان دروسِ قرآن میں منافقت کی حقیقت اور اس کی علامات پر گفتگو کی گئی ہے۔ موضوع کی اَہمیت کے پیش نظر اسے کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ ہم اپنے قول وفعل کے تضاد اور ظاہر و باطن کے تخالف کا جائزہ لے کر اپنی اپنی زندگیوں میں کارفرما منافقت کے مختلف کرداروں کا محاسبہ کریں اور صدقِ دل سے تائب ہو کر صحیح معنوں میں مومنانہ زندگی کی طرف رجوع کریں۔ (آمین بجاہِ سید المرسلین ﷺ)

ڈاکٹر علی اکبر الازہری
ڈائریکٹر ریسرچ
فرید ملّتؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلام کو یہودیوں سے سابقہ پڑا یثرب کے اصلی باشندے گو انصار تھے۔ لیکن عملا اس علاقے کے اقتدار پر یہود کا قبضہ تھا۔ تجارت و زراعت پر انہی کا تسلط تھا۔ تعلیمی اور معاشرتی اعتبار سے بھی یہ زیادہ مستحکم تھے۔ الغرض مذہب، معیشت اور سیاست کے میدان میں یہود کا سکہ رواں تھا۔ یہ بنیادی طور پر کافر نہ تھے بلکہ اہل کتاب میں سے تھے۔ لیکن موسی علیہ السلام کے زمانہ کو اس وقت تقریبا ۱۹ سو سال گزر چکے تھے۔ تورات لفظاً و معناً ہر طرح محرف ہوچکی تھی بلکہ اس سے پہلے اور بعد کی آسمانی کتابیں اور صحیفے بھی تحریف کا شکار ہو چکے تھے۔ سب کے عقائد مسخ ہوگئے تھے۔ ان میں غیر الہامی، باطل خیالات کی آمیزش ہوگئی تھی۔ دینِ حق اور نبوت کو انہوں نے نسل اسرائیل کی وراثت سمجھ رکھا تھا۔ یہودیت پر انہیں بہت ناز تھا۔ اور اسی نسلی تفاخر اور متعصّبانہ زعم نے انہیں گمراہی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ جو تعلیمات الہیہ جس قدر بھی صحیح صورت میں موجود تھیں ان کا اخفاء اور خود تراشیدہ تاویلات کے ذریعے ان کی معنوی تحریف ان کا شیوہ تھا۔ مزید برآں ان کے علماء اور سردار بھی اعتقادی گمراہی کے علاوہ عملی تباہی اور گراوٹ کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ حق پوشی، خود پسندی اور مفاد پرستی کے باعث نہ وہ اپنی اصلاح کے لئے تیار تھے اور نہ ہی کسی ہادی و رہنما کی بات سننے کو، بلکہ راہِ حق کی طرف بلانے والوں کا تمسخر، ان کی مخالفت و مزاحمت اور ان کے خلاف سازش و کینہ پروری ان کی سیرت کا جزو لا ینفک بن چکی تھی۔ فی الحقیقت یہ ایک ایسی بگڑی ہوئی اُمت تھی جس کی اعتقادی اور عملی اصلاح کی کوئی صورت ظاہراً نظر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی تمام علمی، اعتقادی، عملی اور اخلاقی خیانتوں کے باوجود خود کو سب سے بڑا دین دار، دانش مند، ہدایت یافتہ اور بخشش کا مستحق طبقہ تصور کرتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے خدا کے

انعام کوٹھکرا کر اس کے غضب کو دعوت دی تھی اور نتیجۃً تمام نعمتوں سے محروم ہو چکے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے سب سے پہلے ان کی اصلاح اور انکے اعتقادی اور عملی بگاڑ کے اثرات کو زائل کرنا تھا۔ کیونکہ مدینہ میں سب سے زیادہ ذی اثر اور ذی حیثیت لوگ یہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ بقرہ کی تعلیمات کا بیشتر حصہ یہود ہی سے متعلق ہے۔ عامۃ الناس اور ملت اسلامیہ کے لئے بھی ان مخصوص تعلیمات کی اہمیت کچھ کم نہیں کیونکہ یہودیت صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک مستقل ذہنیت بن چکی ہے جس کا مشاہدہ ہم آج بھی مختلف کرداروں کے روپ میں کرسکتے ہیں۔

مدنی دور میں منافقین کا طبقہ بھی نمایاں طور پر معرضِ وجود میں آ گیا تھا۔ اسلام کو کھلی مخالفت و مزاحمت کا سامنا تو آغازِ دعوت کے وقت سے ہی تھا اور اہلِ اسلام اس سلسلے میں بے پناہ مصائب وشدائد برداشت کرتے چلے آئے تھے۔ لیکن ہجرت مدینہ کے بعد ایک نئی طرز کی مخالفت بھی بڑے زور وشور سے شروع ہوگئی اور یہ تھی ''منافقت'' کچھ لوگوں نے زبان سے اقرار کر لیا، ظاہراً اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئے اور مسلمانوں کے ہمراہ اسلامی تحریک میں شامل ہونے کا دعویٰ کرنے لگے لیکن یہ لوگ فی الحقیقت ''منافق'' تھے اور منافقین بھی کئی اقسام کے تھے:

منافقین کی اَقسام

پہلی قسم ایسے منافقین کی تھی جو اسلام کے برحق ہونے کے قائل تھے لیکن اس کی خاطر نہ اپنے مفادات کی قربانی کے لئے تیار تھے اور نہ مصائب و آلام کو برداشت کرنے کے لئے لہذا کچھ خودغرضی و مفاد پرستی اور کچھ بزدلی ان کے سچا مسلمان ہونے کے راستے میں حائل تھی۔

دوسری قسم ایسے منافقین کی تھی جو دل سے قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض سازش اور فتنہ وشر کے لئے اسلامی صفوں میں گھس آئے تھے۔ یہ اسلام کے بہت بڑے

دشمن تھے۔

تیسری قسم ایسے منافقین کی تھی جو اسلام کے اقتدار و حکومت کے باعث مفاد پرستانہ خواہشات کے تحت اسلام سے وابستہ ہوگئے تھے۔ لیکن مخالفینِ اسلام سے بھی اپنا تعلق بدستور قائم رکھے ہوئے تھے تاکہ دونوں طرف سے حسبِ موقع فوائد بھی حاصل کرسکیں اور دونوں طرف کے خطرات سے بھی محفوظ رہیں۔

چوتھی قسم ایسے منافقین کی تھی جو ذہنی طور پر اسلام اور کفر کے درمیان متردد تھے۔ نہ انہیں اسلام کی حقانیت پر کامل اعتماد تھا اور نہ وہ اپنی سابقہ کفر یا جاہلیت پر مطمئن تھے وہ اوروں کی دیکھا دیکھی مسلمان ہوگئے تھے لیکن اسلام ان کے اندر راسخ نہیں ہوا تھا۔

پانچویں قسم ایسے منافقین کی تھی جو اسلام کو حق سمجھے ہوئے دل سے اس کے قائل تو ہو چکے تھے لیکن پرانے اوہام و عقائد اور رسم و رواج کو چھوڑنے، دینی اور اخلاقی پابندیوں کو قبول کرنے اور اوامر و نواہی کے نظام پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کا نفس تیار نہیں ہو رہا تھا۔

چھٹی قسم ایسے منافقین کی تھی جو اسلام کو توحید، احکامِ الٰہی اور آخرت وغیرہ پر ایمان لانے کی حد تک تو تسلیم کرتے تھے لیکن حضور نبی اکرم ﷺ کی غلامی اور وفاداری سے گریزاں تھے۔ نہ وہ حضور ﷺ کی عظمت و سیادت دل سے ماننے کو تیار تھے اور نہ آپ کی حاکمیت و شفاعت۔ اس میں وہ اپنی ہتک اور ذلت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ وہ تعلق نبوی ﷺ کے بغیر ذاتِ ربانی تک رسائی حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

اسلام اپنے پیروکاروں کو تمام منافقین کی پہچان کروانا چاہتا تھا تاکہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں موجود رہ کر اپنے ناپاک عزائم کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ اس لئے سورہ بقرہ نے اس سلسلے میں اہم اشارات فراہم کئے تاکہ حق و باطل میں امتیاز کا صحیح شعور پیدا ہو سکے۔ اس کا دوسرا رکوع اس ضمن میں بطورِ خاص نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَo
يُخٰدِعُوْنَ اللهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْاۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا
يَشْعُرُوْنَo فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللهُ مَرَضاًۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَo وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ
قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَo اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا
يَشْعُرُوْنَo وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْا اَنُؤْمِنُ كَمَا
اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَo وَاِذَا لَقُوا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّاۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيَاطِيْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَo اَللهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَo اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَo مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًاۚ
فَلَمَّا اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمَاتٍ لَّا
يُبْصِرُوْنَo صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَo اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ
السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ
الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللهُ مُحِيْطٌ ۢ بِالْكَافِرِيْنَo يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَاءَلَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَ اِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ
قَامُوْا وَلَوْ شَاءَ اللهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللهَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌo (۱)

(۱) البقرة، ۲: ۸-۲۰

''اور لوگوں میں سے بعض وہ (بھی) ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور یومِ قیامت پر ایمان لائے حالانکہ وہ (ہرگز) مومن نہیں ہیں○ وہ اللہ کو (یعنی رسول ﷺ کو) اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر (فی الحقیقت) وہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے○ ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے○ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد بپا نہ کرو، تو کہتے ہیں: ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں○ آگاہ ہو جاؤ! یہی لوگ (حقیقت میں) فساد کرنے والے ہیں مگر انہیں (اس کا) احساس تک نہیں○ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (تم بھی) ایمان لاؤ جیسے (دوسرے) لوگ ایمان لے آئے ہیں، تو کہتے ہیں کیا ہم بھی (اسی طرح) ایمان لے آئیں جس طرح (وہ) بیوقوف ایمان لے آئے، جان لو بیوقوف (درحقیقت) وہ خود ہیں لیکن انہیں (اپنی بیوقوفی اور ہلکے پن کا) علم نہیں○ اور جب وہ (منافق) اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں، ہم (مسلمانوں کا تو) محض مذاق اڑاتے ہیں○ اللہ انہیں ان کے مذاق کی سزا دیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے (تاکہ وہ خود اپنے انجام تک جا پہنچیں) سو وہ خود اپنی سرکشی میں بھٹک رہے ہیں○ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی لیکن ان کی تجارت فائدہ مند نہ ہوئی اور وہ (فائدہ مند اور نفع بخش سودے کی) راہ جانتے ہی نہ تھے○ ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جس نے (تاریک ماحول میں) آگ جلائی اور جب اس نے گرد و نواح کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا اب وہ کچھ نہیں دیکھتے○ یہ بہرے، گونگے (اور) اندھے ہیں پس وہ (راہِ راست کی طرف) نہیں لوٹیں گے○ یا

ان کی مثال اس بارش کی سی ہے جو آسمان سے برس رہی ہے جس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک (بھی) ہے تو وہ کڑک کے باعث موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں، اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے ٥ یوں لگتا ہے کہ بجلی ان کی بینائی اچک لے جائے گی، جب بھی ان کے لئے (ماحول میں) کچھ چمک ہوتی ہے تو اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل سلب کر لیتا، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ٥‘‘

سورہ بقرہ کے پہلے رکوع میں دو گروہوں کا بیان تھا۔ ایک مومنین و متقین کا اور دوسرا کفار و منکرین کا۔ پہلا گروہ دل و دماغ اور قول و عمل ہر طرح سے ایمان لانے والوں پر مشتمل تھا۔ جب کہ دوسرا گروہ ظاہراً و باطناً ہر طرح سے اسلام کا انکار کرنیوالوں پر۔

یہاں سے تیسرے گروہ کا بیان شروع ہو رہا ہے جو گروہ منافقین ہے۔ مدینہ میں موجود منافقین کی مختلف اقسام کا ذکر ہم اس کتابچہ کی ابتدا میں پہلے ہی کر چکے ہیں۔

مختصر تاریخی پس منظر

یہاں منافقین کے وجود کا مختصر تاریخی پس منظر واضح کرنا ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اہلِ ایمان اور اہل کفر کے علاوہ اہلِ نفاق کا تیسرا گروہ کیوں معرض وجود میں آ گیا تھا۔

اہلِ مدینہ کے قبیلہ خزرج کا ایک بہت بڑا سردار عبد اللہ ابن ابی تھا۔ اُسے اس کے اثر و رسوخ کے باعث مدینہ کا حکمران بنایا جا رہا تھا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی ہجرت سے صورتِ حال میں زبردست تبدیلی آ گئی۔ یہودیوں سمیت تمام اقوام نے متفقہ طور پر آنحضرت ﷺ کو مدینہ کا حاکم تسلیم کر لیا۔ جس سے عبداللہ بن اُبی اور اُس کے مخلص ساتھیوں کے مزعومہ مفادات کو سخت نقصان پہنچا۔

چنانچہ وہ اس دن سے اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے خلاف مخفی کاروائیوں اور پس پردہ سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ یہ طبقہ اسلام کے خلاف کھلی مخالفت و مزاحمت کی جرات نہ کر سکا۔ لہٰذا ظاہرًا اسلام سے وابستگی کا لبادہ اوڑھ کر مختلف قسم کی فتنہ انگیزیوں کا جال بچھانے لگا۔ قرآن مجید نے اس طبقے کی نشاندہی اس قدر جامع اور ہمہ گیر انداز میں کی ہے کہ نہ صرف عہد رسالت کے منافقین کی واضح تصویر سامنے آ جاتی ہے بلکہ ہر دور میں منافقت کے مختلف روپ بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یہاں منافقوں کی علامات اور ان کی نفسیات کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ حقیقت میں یہی خرابی اہلِ اسلام کی ذلت و رسوائی کا باعث بنی ہے۔ اگر اس کی صحیح قرآنی پہچان سامنے رہے اور اس کا علاج بھی قرآن و سنت کے مطابق جرات مندی کے ساتھ کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان زوال و انحطاط کی حالت سے نجات نہ پا سکیں۔

آیت نمبر ۸، ۹ میں منافقت کی دو علامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دعوٰی ایمان صرف زبانی حد تک کرنا اور باطن کا اُس کی تصدیق سے خالی ہونا

ان آیات کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان لانے کی بات تو کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان کا قول ایمان زبان کے اقرار کی حد تک ہے مگر دل کی تصدیق سے محروم ہے۔ اس بیان سے یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ جو بات محض زبان سے کہی جائے دل اس کی تصدیق و تائید نہ کر رہا ہو تو یہ منافقت کی سب سے پہلی پہچان ہے۔ خواہ کہی ہوئی بات خدا و آخرت پر ایمان لانے کی ہی کیوں نہ ہو۔ جب ایسی پاکیزہ بات کا، جو اسلام اور ایمان کا اصل الاصول ہے صرف زبان سے ادا ہونا خدا کے ہاں منافقت ہے تو زندگی کے عام

معاملات میں باہمی گفتگو اور تعلقات کا یہ انداز منافقت کیوں نہ قرار پائے گا۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر ہمیں اپنے شب و روز کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم جس کسی سے جو کچھ بھی کہتے ہیں کیا دل سے کہتے ہیں یا محض زبان سے۔ اگر دل کی کیفیت ہماری زبان کی ہمنوا نہ ہو تو زبان میں تاثیر کہاں سے آئے اور اس منافقانہ رویہ زندگی میں برکت و نتیجہ خیزی کہاں سے پیدا ہو؟

محض توحید و آخرت پر ایمان کو کافی سمجھنا اور رسالتِ محمدی پر ایمان اس قدر ضروری نہ سمجھنا

دوسری علامت جس کا اشارہ ان آیات کے ظاہر عبارت سے ملتا ہے وہ رسالت محمدی ﷺ کی نسبت سوءِ ظن ہے کیونکہ منافقین کے دعوی ایمان کی طرف جو الفاظ منسوب ہوئے ہیں ان میں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے۔ ایمان بالرسالت کا نہیں کیونکہ منافقین کو اصل عداوت اور بغض و عناد حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے تھا جس کے باعث ان کے مفاد پرستانہ عزائم خاک میں مل گئے تھے۔ اس لئے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا ظاہری اعلان بھی کرتے تو اس انداز سے کہ گویا خدا اور آخرت پر ایمان ہی مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے۔ رسول اکرم ﷺ پر ایمان غیر ضروری تصور کرتے تھے۔ اس لئے یہاں قرآن مجید میں ان کے دعوی ایمان کے مذکورہ الفاظ ایمان بالرسالت کے ذکر سے خال ہیں جب کبھی یہ منافقین حضور علیہ السلام کی رسالت کا ظاہراً اقرار بھی کرتے تو یہ اقرار بھی سچا نہ ہوتا بلکہ دل کے انکار اور تعصب و عناد کے باعث سراسر جھوٹ ہوتا۔ جس کا ذکر سورہ منافقین کی پہلی آیت میں یوں آیا ہے:

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللهِ ۘ وَاللهُ يَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَکٰذِبُوْنَ ○[۱]

(۱) المنافقون، ۶۳: ۱

”(اے حبیبِ مکرّم!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اُس کے رسول ہیں، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یقیناً منافق لوگ جھوٹے ہیں ○“

اس اعلان خداوندی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ منافق فی الواقع حضور نبی اکرم ﷺ کی رسالت کے قائل نہ تھے اور جو کوئی ثبوت ان کے اقرار رسالت کی نسبت ملتا ہے وہ قرآنی وضاحت کے مطابق محض جھوٹ اور مکرو فریب تھا۔ اس جگہ بھی رسالتِ مآب ﷺ کی اہمیت کو گھٹاتے بلکہ نظر انداز کرتے ہوئے وہ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعوی کر رہے ہیں جس کا جواب قرآن نے وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ میں دیا ہے کہ جو لوگ پیکر رسالت ﷺ پر صحیح ایمان کے بغیر خدا و آخرت پر ایمان لانے کی بات کرتے ہیں، ان کا دعوی ایمان باطل اور مردود ہے اور وہ منافق ہیں۔ کیونکہ رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر کامل ایمان کے بغیر وہ کس خدا اور کس یوم آخرت کو مانتے ہیں جب کہ خدا اور آخرت کی معرفت و شناسائی بھی انسانیت کو نبی اور رسول کی ذات ہی کے توسط سے ہوتی ہے جب اُس ذات پر ایمان نہ رہا تو باقی عقائد کا کیا اعتبار ہوسکتا ہے؟ اس لئے ایمان بالرسالت کے بغیر باقی دعوی ایمان کو منافقت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس دور میں منافقت کی یہ صورت ذات مصطفوی ﷺ سے عشق و محبت کے فقدان یا کمی کی شکل میں بھی دیکھی جاسکتی ہے اور سنت نبوی ﷺ کی کے انکار کی شکل میں بھی۔

دھوکہ دہی کی نفسیات

یہ منافقین کی تیسری علامت ہے جسے مخادعت سے تعبیر کیا گیا ہے يُخٰدِعُوْنَ، خدع سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی چھپانا اور اصطلاحی معنی دھوکہ دینا ہے۔[1] خادع

(۱) ابن منظور، لسان العرب، ۸: ۶۳

کسی کو دھوکہ دینے کے ارادے میں بھی بولا جاتا ہے اور یہی معنی یہاں مراد ہے۔ منافقین زبانی اقرار اور قلبی انکار کے ذریعے یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ ہم خدا اور اہل ایمان سے اپنی حقیقی فکر اور باطنی حالت چھپا کر انہیں فریب اور غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں، حالانکہ یہ ان کی خود فریبی اور نا سمجھی تھی۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ منافقین کی مخادعت بزعم خویش ذات خداوندی سے نہ تھی۔ بلکہ یہ تو وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ہم اپنی باطنی حالت خدا سے چھپا سکتے ہیں۔ ان کی دھوکہ دہی کی کوشش درحقیقت حضور نبی اکرم ﷺ کی نسبت تھی جن کے بارے میں وہ علیحدگی میں کہتے بھی تھے کہ کیسا رسول ہے، ہم دل سے اس کے ساتھ نہیں ہیں، اس پر ایمان بھی نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود اسے ہماری حالت کی خبر نہیں اور ہمیں بدستور مسلمان سمجھتا ہے۔ حضرت سدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

عرضت علی اُمتی فی صورها فی الطین، کما عرضت علی آدم واعلمت من یؤمن بی و من یکفر بی، فبلغ ذالک المنافقین، فقالوا: استهزاء زعم محمد انه یعلم من یؤمن به و من یکفر ممن لم یخلق بعد ونحن معه و ما یعرفنا. فبلغ ذالک رسول الله ﷺ، فقام علی المنبر، فحمد الله تعالی و اثنی علیه، ثم قال: ما بال اقوام طعنوا فی علمی، لا تسئلونی عن شیء فیما بینکم و بین الساعة إلا نبأتکم به.(۱)

”مجھ پر میری تمام اُمت اپنی حالت خمیر میں پیش کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام پر اشیاء پیش کی گئی تھیں۔ چنانچہ میں نے ہر ایک کو جان لیا ہے کہ کون مجھ پر ایمان لائے گا اور کون نہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد منافقین تک پہنچا تو انہوں نے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ محمد ﷺ یہ گمان

(۱) بغوی، معالم التنزیل، ۱: ۱۴۰

کرتا ہے کہ جو لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے میں ان سے بھی مومن و کافر کو پہچانتا ہوں۔ حالانکہ ہم ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ ہماری منافقت سے باخبر نہیں ہے۔ منافقین کا یہ طعنہ حضور نبی اکرم ﷺ کے علم میں آ گیا۔ آپ اسی وقت منبر پر تشریف فرما ہوئے اور باری تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمانے لگے۔ ان لوگوں کی تباہی کا کیا عالم ہوگا جو میرے علم کی وسعت پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ تم اس وقت سے لے کر قیامت تک جو بات چاہو مجھ سے پوچھ لو۔ میں تمہیں اس کی خبر دیتا ہوں۔"

اس موقعہ پر حضور نبی اکرم ﷺ سے بعض مخفی نوعیت کے سوالات بھی ہوئے جن کا آپ ﷺ نے برجستہ جواب دیا۔ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر آپ ﷺ یہ فرماتے ہوئے خاموش ہو گئے:

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ○(۱)

"کیا تم (ان شر انگیز باتوں سے) باز آ ؤ گے۔"(۲)

مذکورہ بالا حدیث سے یہ امر واضح ہوگیا کہ منافقین حضور نبی اکرم ﷺ کو اپنی حالتِ نفاق سے بے خبر سمجھ کر دھوکہ دینا چاہتے تھے اور ان کا یہی خیال اہل ایمان کی نسبت بھی تھا۔ جس حقیقت کو قرآن نے یوں واشگاف طور پر بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ سے مخادعت، حقیقت میں خدا سے مخادعت ہے جس طرح خود قرآن مجید نے کئی اور مقامات پر یہ اعلان کیا تھا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کو اذیت دینا خدا کو اذیت دینا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے اور حضور نبی اکرم ﷺ کی اطاعت و غلامی خدا کی اطاعت و غلامی ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا گیا: "یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ" (وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں)، جس سے یہ صاف طور پر واضح ہوگیا۔ آنحضرت ﷺ کی شان اقدس میں

(۱) المائدۃ، ۵: ۹۱

(۲) ابن ابی حاتم رازی، تفسیر القرآن العظیم، ۲: ۳۸۹

معمولی سا سوءِ ظن اور ادنیٰ سی گستاخی یا بے ادبی بھی خود شان اُلوہیت میں بے ادبی و گستاخی ہے منافقین کی اس نفسیات کو بیان کرتے ہوئے انہیں بتایا گیا کہ تم خدا اور رسول اور اہل ایمان کو کسی قسم کے دھوکے میں مبتلا نہیں کر سکتے۔ بلکہ تم اس غلط خیال سے خود کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہو اور تمہاری ناسمجھی و نادانی کا یہ عالم ہے کہ تم اپنی اس خود فریبی سے بھی آگاہ نہیں۔ اس آیت کریمہ نے یہ عمومی اصول بھی واضح کر دیا ہے کہ دوسروں سے دھوکہ دہی کی نفسیات حقیقت میں منافقت بھی ہے اور نادانی بھی جو لوگ چرب زبانی اور چالاکی و عیاری سے اپنے ظاہر و باطن کے تضاد پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے دوسروں کو بے وقوف بنالیا ہے وہ منافق تو ہیں ہی لیکن ساتھ ساتھ خود ناسمجھ اور نادان بھی ہیں۔ کیونکہ ملمع پرستی، تصنع، بناوٹ اور منافقت کچھ عرصہ کے لئے تو مخفی رہ سکتی ہے، ہمیشہ کے لئے نہیں یہ حقیقت بالآخر بے نقاب ہو کر رہتی ہے۔ اسلئے ان مصنوعی طریقوں سے دوسروں کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس اصول کی روشنی میں ہمیں اپنے کردار کا بھی دیانتدارانہ جائزہ لینا چاہیے کہ اس نوعیت کی عملی منافقت کس حد تک ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی اور تعلقات کا بیشتر حصہ اسی قسم کی عملی منافقت سے عبارت ہے۔ ہر شخص دوسرے کو دھوکہ دینے میں مگن ہے اور وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس عمل کے نتیجے میں فی الواقع وہ خود دھوکہ کھا رہا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

المكر و الخديعة و الخيانة في النار.(۱)

”دھوکہ دہی، وعدہ خلافی اور بددیانتی سب جہنم کا باعث ہیں۔“

اس حدیث نبوی کے مطابق کیا ہم معاشرتی سطح پر جہنمی زندگی بسر نہیں کر رہے؟

---

(۱) حاکم، المستدرك على الصحيحين، ۴: ۶۵۰، رقم: ۸۷۹۵

قلب و باطن کا بیمار ہونا

یہاں منافقت کو دل کی بیماری سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اگر منافقت جیسی بیماری قلب و باطن کو لگ جائے تو اس میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ منافق کا ہر قول و فعل سراسر جھوٹ بن جاتا ہے کیونکہ جو کچھ وہ کہتا یا کرتا ہے، اس کا محرک اس کے دل کا خبث اور بدنیتی ہوتی ہے۔ بالآخر اس کی ساری زندگی جھوٹ جیسے گناہ کبیرہ سے آلودہ ہوجاتی ہے۔ اور وہ دردناک عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ آیت مندرجہ سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ جس طرح انسانی جسم مختلف امراض کا شکار ہوتا ہے۔ اور جسمانی بیماری یا معدے کی خرابی کے باعث اچھی غذا بھی جسم پر بہتر نتائج مرتب نہیں کرسکتی، اسی طرح انسانی قلب و باطن اور روح بھی مختلف امراض سے دوچار ہوتی ہے۔ اگر دل بیمار پڑ جائے تو بہتر سے بہتر نصیحت بھی اثر نہیں کرتی۔ یہ باطنی بیماریاں جو منافقت سے جڑ پکڑتی ہیں، بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ان کا علاج وعظ و نصیحت اور مطالعہ کتب سے نہیں بلکہ اہل نظر کی نظر سے ہوتا ہے جیسا کہ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں (۱)

جو لوگ اپنے باطنی امراض کی اصلاح کے لیے بارگاہِ مصطفوی ﷺ کی طرف متوجہ ہوتے تھے، ان کے قلب و باطن کو وہ صحت و تندرستی اور صفائی و نورانیت میسر آتی تھی کہ وہ آگے بھی ہزاروں بیماروں کو تندرست زندگی بخش سکتے تھے۔ کیونکہ یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ کے مطابق انہیں تزکیہ و تصفیہ خود نگاہِ رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ اقدس سے عطا ہوتا تھا کچھ لوگ بغض و عناد اور حسد و عداوت رکھتے تھے بلکہ جب بھی انہیں ان کی بہتری کے لیے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ کی طرف نیاز مندی کے ساتھ آنے کی دعوت دی جاتی تھی تو وہ غرور و تکبر کے ساتھ اپنا سر جھٹک دیتے جیسا کہ خود قرآن ان الفاظ میں

(۱) اِقبال، کلیات (بال جبریل): ۵۴

شہادت مہیا کر رہا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ○ (۱)

’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ (ﷺ) تمہارے لیے مغفرت طلب فرمائیں تو یہ (منافق گستاخی سے) اپنے سر جھٹک کر پھیر لیتے ہیں اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ تکبر کرتے ہوئے (آپ کی خدمت میں آنے سے) گریز کرتے ہیں ○‘‘

جب حضور نبی اکرم ﷺ سے حسد و عداوت اور منافقت کا یہ عالم ہو کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے اپنی بہتری بھی پسند نہ کرتے ہوں تو ان کی بیماریوں کی اصلاح کیونکہ ممکن ہوسکتی ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا گیا:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ لا فَزَادَهُمُ اللهُ مَرَضًا ج وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ م بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○ (۲)

’’ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے ○‘‘

یہاں تک کہ وہ اپنے جھوٹ کی پاداش میں دردناک عذاب کو جا پہنچتے ہیں۔ ان منافقین کی زندگی کو جھوٹ کے معمول سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ جب ان کے دل میں ذاتِ نبوی ﷺ اور اسلام کی نسبت اس قدر بغض اور حسد و عداوت کارفرما ہے تو ان کا نام لینا، اسلام سے وفاداری کا دم بھرنا، نمازیں پڑھنا اور دیگر فرائض دینی کی ظاہری ادائیگی کا اہتمام کرنا سب جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔

(۱) المنافقون ۶۳: ۵

(۲) البقرة، ۲: ۱۰

جھوٹ علامت نفاق ہے

اسی آیت نمبر ۱۰ میں جھوٹ کو علامتِ نفاق کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک مقام پر منافق کی چار علامتیں بیان فرمائیں جن میں سے ایک جھوٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

إذا حدث كذب.(۱)

''منافق جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔''

یہاں جھوٹ کو دردناک عذاب کا باعث بھی کہا گیا ہے۔

لفظ عذاب کی لغوی تحقیق

اس لفظ کا مادہ عَذُب ہے۔ شیریں اور عمدہ پانی کو ماءٌ عَذُبٌ کہتے ہیں۔(۲) قرآن حکیم میں ہے:

هٰذَا عَذُبٌ فُرَاتٌ.(۳)

''یہ (ایک) نہایت میٹھا شیریں ہے۔''

عذب کا دوسرا معنی سخت دکھ ہے۔ اس مفہوم کی بنیاد یہ ہے کہ عَذَبَ الرَّجُلُ کے معنی آتے ہیں کہ ''اس نے کھانا پینا ترک کر دیا۔''(۴) لہٰذا تعذیب اصل میں کھانے پینے اور آرام وسکون یعنی زندگی کی راحتوں اور آسائشوں سے محروم کر دینے کا نام ہے۔ گویا تعذیب ازالۂ عذب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ تمریض، ازالۂ مرض کے

(۱) بخاری، الصحيح، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق، ۱: ۲۱، رقم: ۳۳
(۲) ابن منظور، لسان العرب، ۱: ۵۸۳
(۳) الفرقان، ۲۵: ۵۳
(۴) ابن منظور، لسان العرب، ۱: ۵۸۳

معنی میں۔ چنانچہ وہ کیفیت جس میں لذاتِ حیات اور آرام وسکون سے محروم کر دیا جائے اور اسی وجہ سے انسان کو دکھ اور اذیت کا احساس ہو ’’عذاب‘‘ کہلاتی ہے۔ اسی وجہ سے عذاب دنیوی بھی ہوتا ہے اور اخروی بھی۔ اگر عذاب مقدار (quantity) کے اعتبار سے زیادہ ہو تو اسے عَذَابٌ عَظِیۡمٌ کہا جاتا ہے، اور اگر کیفیت و ماہیت (quality & nature) کے اعتبار سے زیادہ دردناک اور اذیت ناک ہو تو اسے عَذَابٌ اَلِیۡمٌ کہتے ہیں۔ اب آپ غور فرمائیں آیت ۷ میں کفار کے لیے عذاب عظیم کی وعید ہے۔ جب کہ یہاں منافقین کے لیے عذاب الیم کی۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ منافقت کفر سے بھی زیادہ تباہ کن اور اذیت ناک عذاب کا باعث ہوتی ہے۔

نام نہاد اِصلاح کے پردے میں فساد انگیزی

ان آیات میں منافقت کی ایک اور علامت اور منافقت کا ایک نیا روپ بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ ہے نام نہاد اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی۔ اِمام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

الفساد: خروج الشيء عن الإعتدال. (۱)

’’فساد کسی چیز کے اعتدال کی حد سے گزر جانے کو کہتے ہیں۔‘‘

خواہ افراط کی صورت میں ہو یا تفریط کی۔ لہٰذا کسی شخص کا ہر وہ عمل جو خلافِ عدل ہو فساد سے تعبیر کیا جائے گا۔ جب کہ عدل کی تعریف ہے:

وضع الشي في موضعه. (۲)

’’کسی شے کو اپنے صحیح مقام پر رکھنا۔‘‘

---

(۱) اصفہانی، مفردات ألفاظ القرآن، ۱: ۱۱۱۴

(۲) جرجانی، التعریفات: ۱۳۰

اگر کوئی شے اپنے اس مقام سے ہٹا دی جائے جس کی وہ مستحق تھی یا کسی شے کو ایسے مقام پر رکھ دیا جائے جس کی وہ مستحق نہ تھی تو ان دونوں حالتوں کا نام فساد اور ظلم ہے۔ ایسے ہی ہر عمل کو خلافِ عدل یا بے اعتدالی کہتے ہیں۔ چنانچہ **فساد فی الارض** ایسی جامع اصطلاح ہے کہ اس میں ہر ظلم و زیادتی، بے اصولی، نا انصافی، حق تلفی و استحصال، اثم وعدوان، گمراہی و ضلالت، شر انگیزی و فتنہ پروری، منافقت و منافرت، تخریبی و سازشی کارروائیاں اور منفی اندازِ فکر و عمل شامل ہیں۔ عقائد و نظریات اور اعمال و افعال کے جس نظام سے ارضی زندگی اور انسانی سوسائٹی میں عدل و انصاف اور صداقت و شرافت کی اقدار قائم رہیں بلکہ فروغ پاتی رہیں اور ہر حقدار کو اس کا صحیح حق ملتا رہے وہ نظامِ حق پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اسی حالت کو صلاح و فلاح کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی عمل سے اس نظامِ حق عدل کے فروغ میں تعطل پیدا ہو یا حصولِ فلاح کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو تو اسے فساد فی الارض سے تعبیر کیا جائے گا۔ قرآن حکیم جملہ منافقین کی نسبت یہ واضح اعلان کر رہا ہے کہ ان کا اندازِ فکر و عمل ہمیشہ مفسدانہ، منفی، تخریبی اور استحصالی ہوتا ہے، جو انسانی سوسائٹی کے لیے ضرور کسی نہ کسی طور پر نقصان دہ ہوتا ہے۔ طُرّہ یہ کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد کرنے والے نہ بنو تو وہ اپنے آپ کو کبھی مفسد تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، وہ خود کو پورے معاشرے میں نہ صرف سب سے بڑا صالح بلکہ واحد مصلح تصور کرتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، یہی حق ہے اور اسی سے معاشرے کی اصلاح ممکن ہے۔ چنانچہ اس نام نہاد صالحیت اور مصلحیت کے زعم میں مبتلا ہو کر فساد انگیزی جاری رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم انکے زعمِ باطل کو رد کرتے ہوئے برملا اعلان کر رہا ہے کہ ان کی مصلحانہ نعرہ بازی اور نیکی کی ظاہری دعوت دیکھ کر کہیں انہیں مخلص رہنما اور قومی مصلح تصور ہی نہ کر لیا جائے بلکہ آگاہ ہو جاؤ! یہی لوگ حقیقت میں فساد برپا کرنے والے ہیں، یہی لوگ فتنہ و شر کا منبع و سرچشمہ ہیں۔ ان کی تمام نام نہاد اصلاحی کاروائیاں منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ پھر ان کی بدبختی کی انتہا یہ ہے کہ یا تو انہیں اپنے مفسدانہ عمل کا علم و شعور ہی نہیں ہوتا اور اصلاح کی خوش فہمی میں ہی فساد بپا کرتے چلے جاتے ہیں۔ یا وہ

اپنے منافقانہ مفادات میں اس قدر حریص ہو چکے ہوتے ہیں کہ جانتے ہوئے بھی اپنے عمل کو فساد انگیزی تصور نہیں کر سکتے۔ گویا یہ احساس ان کی لوحِ قلب و دماغ سے مٹ چکا ہوتا ہے کہ کیا ہم بھی فساد کا باعث ہو سکتے ہیں؟ قرآن مجید نے منافقت کی یہ ایسی اہم علامت بیان کی ہے کہ جس کا صدور وظہور ہر دور میں یکساں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ آپ تاریخ اسلام کا مطالعہ فرما لیجئے۔ مسلمانوں میں جس قدر باطل فرقے، الحادی تحریکیں، متشدد سازشی جماعتیں اور متکبر قیادتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں ان کا ہمیشہ یہی دعویٰ اور نعرہ رہا ہے کہ ہم مسلمانوں کی اصلاح چاہتی ہیں۔ مسلمان اپنے عقائد و اعمال کے لحاظ سے تباہ ہو چکے ہیں اس لیے ہماری کاوش انہیں اعتقادی اور عملی گمراہیوں سے نجات دلا کر صحیح اسلامی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ کسی نے بھی خود سے بڑھ کر کسی اور کو مصلح تصور نہیں کیا۔ نتیجتًا ایسی تحریکیں کئی مسلمانوں کو اصلاحِ احوال کے دلکش اور دلفریب نعروں کی جاذبیت کے باعث اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور دینِ حق کی صحیح راہ سے بہکانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی عمومی اعتقادی اور عملی حالت اصلاح طلب ہے اور اصلاح طلب رہتی ہے۔ چنانچہ ان کی اصلاح کا فریضہ بھی اہلِ علم کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ بلکہ اہلِ اقتدار بھی جنہیں فی الواقع مصلح کا کردار ادا کرنا چاہیے اکثر اوقات خود اصلاح کے ضرورت مند ہوتے ہیں اور یہ کام بھی معاشرے کے زعماء و علماء کے ذمے ہوتا ہے۔ لہٰذا کئی سمتوں سے اصلاحِ احوال کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ یہاں وہ نازک منزل آتی ہے جہاں اہلِ اسلام کو حق پرستانہ اور منافقانہ نعروں میں امتیاز کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس امتیاز کو پیشِ نظر رکھے بغیر اگر ہر قیادت اور ہر دعوت کی پیروی شروع کر دی جائے تو احوال سنورنے کی بجائے اور بگڑتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ کوئی ظاہراً دعوتِ اصلاح دے رہا ہو تو حق و باطل میں امتیاز کا معیار کیا ہوگا؟ قرآن حکیم کی یہ آیات اسی معیارِ امتیاز کو واضح کر رہی ہیں۔ قرآن منافقت کے مختلف روپ چن چن کر بے نقاب کر رہا ہے۔ اگر سب علامات کو

www.MinhajBooks.com

سامنے رکھ کر اسی قرآنی معیار پر حق پرستی اور منافقت کی پرکھ کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دھوکہ وفریب کی گنجائش باقی رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم قرآنی معیارِ حق کی بات تو کرتے ہیں لیکن عملاً اس معیار پر کھوٹے اور کھرے کی پرکھ نہیں کرتے پرکھ کے لیے ہم نے اپنے ذہنی معیارات اور مفاد پرستانہ پیمانے قائم کر رکھے ہیں اگر قرآن ان پر پورا اترے تو اسے مانتے ہیں ورنہ اس کی بھی تاویل کر لیتے ہیں۔

دوسروں کو بے وقوف اور صرف خود کو اہلِ عقل و دانش سمجھنا

یہاں منافقین کی ایک اور توجہ طلب نفسیاتی علامت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ اپنے سوا دوسرے مسلمانوں کو بے وقوف، کم فہم اور کم عقل سمجھنا۔ بلکہ دوسروں کو اپنی نام نہاد عقل و دانش اور فہم و فراست کے مقابلے میں اس قدر ہلکا تصور کرنا کہ ان کی ڈگر کو بے عقلی اور گمراہی تصور کرنا۔

السفہاء کا معنی

یہ سفیہ کی جمع ہے سفہ کے اصل معنی خفت، کمزوری، ردی پن اور ہلکا پن کے ہیں۔ ہلکے اور کمزور جسم والے کو سفیہ البدن اور گھٹیا کپڑے کو ثَوْبٌ سفیهٌ کہتے ہیں۔(۱) چوں کہ کم عقلی انسان کا سب سے ہلکا پن ہے۔ اس لیے عام استعمال میں سفیہ کا معنی بے وقوف اور کم عقل کیا جاتا ہے۔ اقتصادی نظم ونسق کی سوجھ بوجھ میں کمی کے باعث بعض لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

---

(۱) فیروز آبادی، القاموس المحیط، ۱: ۱۶۰۹

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ○[1]

’’اور یتیموں کی (تربیتاً) جانچ اور آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں ہوشیاری (اور حُسنِ تدبیر) دیکھ لو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو، اور ان کے مال فضول خرچی اور جلد بازی میں (اس اندیشے سے) نہ کھا ڈالو کہ وہ بڑے ہو (کر واپس لے) جائیں گے، اور جو کوئی خوشحال ہو وہ (مالِ یتیم سے) بالکل بچا رہے اور جو (خود) نادار ہو اسے (صرف) مناسب حد تک کھانا چاہیئے، اور جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنے لگو تو ان پر گواہ بنا لیا کرو، اور حساب لینے والا اللہ ہی کافی ہے○‘‘

عہد رسالت میں جب منافقوں سے یہ کہا جاتا کہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح دل سے ایمان لے آؤ اور اسلام کے خلاف خفیہ فتنہ و سازش بند کردو تو وہ جواب دیتے کہ دوسرے لوگ تو بیوقوف اور کم عقل ہیں جنہوں نے دل سے حضرت محمد ﷺ کی غلامی اختیار کرلی ہے اور اسلام کی خاطر ہر طرح کی جانی و مالی قربانیاں پیش کررہے ہیں۔ کیا ہم بھی ان کی طرح بے وقوف ہوجائیں اور دنیوی منفعتوں کو نظر انداز کردیں۔ ہمیں کیا پڑی کہ ان بے وقوفوں کی طرح ہر کسی سے مخالفت مول لیتے پھریں۔ اپنی رشتہ داریا دیرینہ دوستیاں اور سابقہ تعلقات بگاڑ لیں۔ پھر اسلام کے لیے پیغمبر اسلام ﷺ کے کہنے پر ہر قسم کی قربانی دیں۔ جنگوں میں حصہ لیں، دن کی مصروفیات اور رات کے آرام و سکوں کو قربان کریں۔ اپنی سرداریاں چھوڑیں اور ایک شخص کے حلقۂ غلامی میں آ جائیں۔ دراصل ان منافقین کے سامنے اسلام کا اصلی روپ اور حقیقی روح تھی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حبیب کبریا ﷺ کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بنتے دیکھا تھا۔ ان پر حقیقت ہر وقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

(۱) النساء، ۴: ۶

جب اہلِ مدینہ کا ایک وفد بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر حضور نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دے کے قبولِ اسلام کا حلف اٹھا رہا تھا تو اس وقت حضرت عباس بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر برملا یہ اعلان کیا:

اِنَّکُمْ تبايعونهٗ علٰی حرب الأحمر والأسود من الناس.(۱)

’’تم حضور نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر فی الحقیقت اس امر کی بیعت کر رہے ہو کہ اسلام کی خاطر دنیا کے ہر سرخ و سیاہ انسان سے جنگ کرو گے۔‘‘

جس پر سب نے بیک آواز لبیک کہا یہ تھی وہ بنیادی روح جو ایمان لاتے ہی عالمِ کفر و طاغوت کی بے پناہ مخالفتوں اور عداوتوں کی وجہ سے ہر مسلمان کے لیے لازمہ حیات بن جاتی ہے۔ اس کے بغیر کسی کا مسلمان ہونا ہی نامکمل رہتا تھا۔ منافقین کی سوچ کیونکہ خالصتاً مادہ پرستی پر مبنی تھی، وہ ہر چیز کو دنیوی سود وزیاں کے مزعومہ پیمانے پر پرکھتے تھے۔ سابقہ آرام کی زندگی کو چھوڑ کر اس مسلسل انقلابی زندگی کو اپنا لینا انہیں اپنی نظر میں کم عقلی نظر آتا تھا وہ خود کو عقل مند تصور کرتے تھے۔ قرآن ان کی نام نہاد عقلمندی کو بے سمجھی اور کم فہمی سے تعبیر کر رہا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس قربانی کی زندگی میں سب سے بڑا نفع مضمر ہے۔ آخرت کا نفع تمام دنیوی منافع سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ وہ خود چار روزہ زندگی کی ظاہری منفعت کو دیکھ کر اُخروی زندگی کی دائمی اور ابدی منفعت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ بے سمجھی اور بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟ باری تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى.(۲)

’’آپ انہیں فرما دیجئے کہ دنیا کا مفاد بہت تھوڑا (یعنی معمولی شے) ہے اور آخرت بہت اچھی (نعمت) ہے، اس کے لیے جو پرہیزگار بن جائے۔‘‘

---

(۱) ۱۔ طبری، تاریخ الأمم والملوك، ۱: ۵۶۳

۲۔ ابن ہشام، السيرة النبوية، ۲: ۲۹۵

(۲) النساء، ۴: ۷۷

قرآنِ مجید نے منافقت کی یہ علامت ایک مستقل مادہ پرستانہ ذہنیت کے طور پر نمایاں کی ہے۔ آج ہم میں سے کتنے ہیں جو اس ذہنیت سے کلیۃً پاک ہیں؟ اگر کوئی خوش نصیب دینِ حق کی راہ میں معمولی سی قربانی کے لیے بھی تیار ہوتا ہے تو اس کے اعزا واقرباء اور دوست و احباب کیا اسے اپنے وقت، مال و دولت اور دیگر آسائشوں کے زیاں کا طعنہ نہیں دیتے؟ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو اندازہ فرمایئے کہ منافقت کس حد تک ہمارے رگ و ریشے میں رچ بس چکی ہے۔ ہم دین کو صرف اسی حد تک اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ جس حد تک جانی و مالی مفادات پر زد نہ پڑتی ہو۔ جہاں دینِ حق کو جان و مال اور وقت کی قربانی مطلوب ہو۔ ہم اس حد میں داخل ہونے کو بے وقوفی سمجھتے ہیں۔ یہ ہے منافقت کی وہ اصل جو دین کی احیاء کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ یاد رکھیئے کہ دین سراسر قربانی کا نام ہے اگر زندگی اس جذبے اور عمل سے خالی ہو تو کوئی بھی شخص جس قدر دین داری کا چاہے ڈھنڈورا پیٹتا رہے قرآن کی نظر میں اس کا نام منافقت ہے۔ ایسی منافقت کے ساتھ ادا کی جانے والی نمازیں بھی ریا کاری تصور ہوتی ہیں، جن پر بجائے ثواب کا مستحق ہونے کے سخت اذیت ناک عذاب کی وعید آئی ہے۔ سورۃ الماعون اس حقیقت کی واضح عکاسی کرتی ہے۔

اُمتِ مسلمہ کے اکثر افراد کو گمراہ تصور کرنا منافقانہ سوچ ہے

اہل مدینہ میں سے اکثر افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ جب کہ منافقین کی تعداد ان کے مقابلے میں خاصی کم تھی۔ یہاں قرآنِ مجید نے ایک اصولی انداز کو اپنایا ہے۔ منافقین سے کہا جا رہا ہے:

اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ.[(۱)]

”(تم بھی) ایمان لاؤ جیسے (دوسرے) لوگ ایمان لے آئے ہیں۔“

(۱) البقرۃ، ۲: ۱۳

قاعدہ یہ ہے:

لِلأكثرِ حكم الكلّ.(۱)

''اکثر کے لیے کُل ہی کا حکم ہوتا ہے۔''

یہاں بھی الناس سے مراد اکثر الناس ہیں۔ کیونکہ سارے لوگ تو صاف ظاہر ہے کہ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے۔ ان میں اکثر افراد نے ہی یہ شرف حاصل کیا تھا۔ یہاں قرآنی استدلال یہ ہے کہ جب اکثر افراد نے ہی یہ شرف حاصل کیا تھا۔ یہاں قرآنی استدلال یہ ہے کہ جب اکثر افراد اُمّت دل و جان سے حلقہ بگوش اسلام ہو کر حضور نبی اکرم ﷺ کی غلامی اختیار کر چکے ہیں تو تم اقلیت میں ہوتے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت کے مخالفت کیوں کر رہے ہو؟ تم بھی اپنی عقل و دانش کے فیصلے پر ڈٹے رہنے کی بجائے اہلِ اسلام کی اکثریت کی پیروی کر لو اور ایمان لے آؤ۔ اس پر منافقین یہ جواب دیتے تھے کہ وہ تو سب کے سب کم فہم، کم علم بے عقل ہیں۔ وہ تو گمراہ ہو چکے ہیں بھلا ہم ان بے وقوفوں کے پیچھے کیوں لگ جائیں۔ قرآن مجید نے اس اندازِ فکر کو منافقت سے تعبیر کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کو گمراہ اور بے عقل تصور کرنا خود بے عقلی اور گمراہی کی بات ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی سوسائٹی کے چند افراد یا کوئی ایک آدھ شخص خود کو ہی صاحبِ عقل و فہم اور راست فکر کا حامل تصور کرتے ہوئے اپنی رائے اور تحقیق کو صحیح اور باقی امتِ مسلمہ کی اکثریت کو گمراہ قرار دینے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی اکثریت کبھی گمراہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اہلِ اسلام کی اکثریتی جماعت پر خدا کی حفاظت کا ہاتھ رہتا ہے۔ یہ بھی حضور نبی اکرم ﷺ کی رحمت اور برکت کے توسط سے آپ ﷺ کی اُمت کے خصائص میں سے ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) ۱۔ سرخسی، المبسوط، ۴: ۱۸۳

۲۔ مقدسی، الفروع، ۱: ۳۵۰

اِنَّ اللہ لا یجمع امتی علٰی ضلالة، ویدُ اللہ علی الجماعة، من شذ شذ فی النار.(۱)

''اللہ تعالیٰ میری اُمت کو کبھی گمراہی پر اکٹھا نہ ہونے دے گا۔ جماعت پر اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا ہاتھ ہے، جو کوئی اس سے جدا ہوگا، دوزخ میں جائے گا۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُمّت کے جمع ہونے سے کیا مراد ہے؟ حضور نبی اکرم ﷺ نے خود اس امر کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

اثنان خیر من واحدٍ وثلاثةٌ خیرٌ من اثنین واربعة خیرٌ من ثلاثةٍ، فعلیکم بالجماعة، فإن اللہ لن یجمع أمتی إلّا علٰی هدًی.(۲)

''کسی مسئلے پر دو کا ایک کے مقابلے میں جمع ہونا بہتر اور محفوظ ہے۔ اسی طرح تین دو کے مقابلے میں بہتر ہیں اور چار، تین کے مقابلے میں تم پر اکثریتی جماعت کی پیروی لازم ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ میری امت کو سوائے ہدایت کے کسی غلط بات پر جمع نہیں ہونے دے گا۔''

حضرت ابو جعفر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

تشاوروا فی أمرکم، فإن کان اثنان واثنان، فارجعوا فی الشوریٰ، فإن کان أربعة واثنان، فخذوا صنف الأکثر.(۳)

(۱) ترمذی، الجامع الصحیح، کتاب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعة، ۴: ۴۶۶، رقم: ۲۱۶۷

(۲) احمد بن حنبل، المسند، ۵: ۱۴۵، رقم: ۲۱۳۳۱

(۳) ۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۳: ۶۱

۲۔ ہندی، کنز العمال، ۵: ۹۰۵، رقم: ۱۴۲۵۰

''اپنے امور میں باہمی مشورہ کیا کرو، اگر کسی مسئلے پر رائے دو اور دو افراد میں مساوی تقسیم ہو جائے تو پھر اُسے شوریٰ میں لے جاؤ۔ اگر رائے کی تقسیم چار اور دو میں ہو جائے تو اکثریتی رائے کو اپنا لو۔''

اُمتِ مسلمہ کی اکثریتی رائے کی تمام اُمت یا کل جماعت مسلمہ کی رائے اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ ہر مسئلے پر فی الواقع سو فی صد اتفاق رائے عقلاً و نقلاً ناممکنات میں سے ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین کا عمل بھی یہی تھا کہ مشاورت میں اکثریتی رائے کا احترام فرماتے۔ خلفاء راشدین کے اِستخلاف میں بھی جہاں ضرورت پڑی اسی اصول کو اپنایا گیا بلکہ اکثریتی رائے کے اقلیتی رائے پر فائق ہونے کا اصول پوری دنیا کے مسلمات میں سے ہے جس پر اہلِ اسلام اور غیر اہلِ اسلام میں سے کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ قرآن مجید نے یہاں منافقین کے اقلیتی گروہ کو کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ کہہ کر اکثریتی طبقے کی راہ کو اپنانے کا استدلال اختیار کیا۔ جس پر ان کا جواب تھا کہ ''ہم کیسے ان لوگوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ وہ تو عقل و شعور اور فہم و بصیرت سے عاری ہیں۔'' باری تعالیٰ نے اس اندازِ فکر کو منافقت سے تعبیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اپنی رائے اور تحقیق کو اکثریتی رائے اور تحقیق پر فائق سمجھنا اور مسلمانوں کی اکثریت کو گمراہ تصور کرنا، خود گمراہی، بے عقلی اور بے بصیرتی ہے۔'' گویا اس اصول کے بیان سے قرآنِ حکیم نے امتِ مسلمہ کے اندر نام نہاد اصلاح و تجدید کے نام پر آئے دن پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے فکری اور اعتقادی فتنوں اور متجدّدانہ تحریکوں کا سدِّباب کیا ہے جو ہمیشہ اُمتِ مسلمہ کے اکثریتی طبقے کو گمراہ، کافر و مشرک، بدعتی اور بے وقوف قرار دیتی ہیں۔ اس تصور کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مسلمانوں کے اکثریتی طبقے میں کوئی خرابی یا بگاڑ پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بگاڑ اور خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن ہمیشہ پیغمبرانہ تعلیمات کے مطابق اکثریتی طبقے کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے یعنی سوادِ اعظم سے منسلک رہتے ہی اُمت کی اصلاح کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ اہلِ ایمان کے سوادِ اعظم کو گمراہ قرار دے کر یا اس

سے خارج ہو کر اپنے لیے نئی راہ بنانا یہی حقیقت میں گمراہی اور منافقت ہے اور اسی سے حضور نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس مفہوم کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

الزموا السواد الاعظم فان يد الله على الجماعة وايّا كم والفرقة فانّ الشّاذ من الناس للشيطان كما انّ الشّاذ من الغنم للذئب.(۱)

"اُمتِ محمدی ﷺ کے سب سے بڑے گروہ سے منسلک ہو جاؤ کیونکہ اللہ کی حفاظت کا ہاتھ اس جماعت پر ہے اور اس اکثریتی طبقے سے الگ ہونے یعنی فرقہ بندی کرنے سے گریز کرو۔ بے شک جو لوگوں کے اکثریتی گروہ سے الگ ہوتا ہے شیطان کے ہاتھ چڑھ جاتا ہے جیسے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے الگ ہونے والی بکری بھیڑیے کے ہاتھ چڑھ جاتی ہے۔"

کَمَا اٰمَنَ النَّاسُ سے اِجماعِ اُمت کے وجوب پر اِستدلال اور منافقین کا اِس سے گریز

اس آیت کا مبداء استدلال یہ بھی ہے کہ اُمت کی اکثریت کا کسی مسئلے پر متفق ہو جانا خود بھی شرعی دلیل قرار پاتا ہے۔ اس پر عمل ضروری اور اس سے انحراف حرام ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآنِ مجید نے بالعموم اہلِ ایمان کی راہ کی پیروی نہ کرنے کو براہِ راست رسولِ اکرم ﷺ کی مخالفت اور گمراہی قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَ تْ مَصِيْرًا○(۲)

(۱) نہج البلاغہ: ۳۸۳

(۲) النساء، ۴: ۱۱۵

’’اور جو شخص رسول (ﷺ) کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس پر ہدایت کی راہ واضح ہو چکی اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی (گمراہی) کی طرف پھیرے رکھیں گے جدھر وہ (خود) پھر گیا ہے اور (بالآخر) اسے دوزخ میں ڈالیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے o‘‘

لہٰذا آیت زیر مطالعہ، آیتِ متذکرہ اور مندرجہ بالا احادیث سب اجماعِ اُمت کے واجب ہونے کی متقاضی ہیں۔ اس لیے اہلِ اسلام کے نزدیک متفقہ طور پر قرآن و سنت کے بعد ’’اجماع‘‘ کو تیسرے ماخذِ شرعی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اجماع اُمت یا مسلمانوں کے اکثریتی طبقے کے اتفاقِ رائے سے مراد امت کے جہلاء اور محض عوام ہی کے اکثریت کا بغیر دلیل کے کسی مسئلے پر مجتمع ہونا نہیں ہے۔ کیونکہ عوام کو ازخود مسائل کا صحیح علم بھی نہیں ہوتا جب اُمت کا اکثریتی طبقہ کسی دینی موقف پر متفق ہوتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد علماء راسخین اور مجتہدینِ اُمت کی تحقیق و تصریح یا اہلِ علم کا تعامل و تواتر ہی ہوتا ہے۔ اہلِ علم کے قبولِ عام کی بنا پر اس شرعی مؤقف کو امتِ مسلمہ کی اکثریت بھی قبول کر لیتی ہے۔

لہٰذا اس مسئلے پر ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے کہ اُمّتِ مسلمہ کے اکثریتی طبقے کا اجماع ازخود واقع نہیں ہوجاتا بلکہ یہ اجماع ہمیشہ اہلِ علم و اجتہاد کی اکثریت کے نزدیک کسی مسئلے پر ’’تلقی بالقبول‘‘ کی بنا پر واقع ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اجماعِ امت یا سوادِ اعظم پر مبنی مذہب کو شریعت نے مذہبِ حق قرار دیا ہے۔

عہدِ صحابہ میں بھی تمام صحابہ معروف بالعلم والاجتہاد نہ تھے۔ رسوخ فی العلم اور اجتہادی بصیرت تو بعض صحابہ کو ہی حاصل تھی۔ جب کہ باقی صحابہ اس دور کے عوام الناس کے زمرے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اجماعِ صحابہ یا صحابہ کے اکثریتی طبقے کا اتفاق رائے اس لیے آج بھی شرعاً حجت ہے کہ اس کی بنیاد بھی اہلِ علم صحابہ کا اجتہاد ہوتا تھا۔ جو ہمیشہ قرآن و سنت کی روشنی میں واقع ہوتا۔ جب اسے تمام یا اکثر صحابہ قبولِ عام

ہو جاتا تو وہی اجتہاد، اجماع قرار پاتا۔ اور اسی کو سوادِ اعظم کا مسلک کہا جاتا تھا تعاملِ صحابہ یا آثارِ تابعین کے متعدد نظائر و شواہد اسی طور واقع ہوئے ہیں۔

لہٰذا اُمتِ محمدی ﷺ کے اکثریتی طبقے کو قرآن و سنت کے خلاف اور گمراہ تصور کرنا دراصل اپنی آمریت کو قرآن و سنت یا اسلام کا نام دے کر دوسروں پر مسلط کرنے کی خواہش ہے۔ اس لیے اسے قرآن مجید نے منافقت قرار دیا۔

کردار کا دوغلا پن اور ظاہر و باطن کا تضاد

یہاں منافقین کی ایک اور علامت بیان کی گئی ہے اور وہ ہے، کردار کا دوغلا پن اسی کو ظاہر و باطن کا تضاد کہتے ہیں۔ منافقین کا رویہ بزدلانہ تھا۔ وہ اپنے اندر کے کفر کو مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے باعث ظاہر کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اپنا تعلق اپنے وڈیروں اور سرمایہ داروں سے منقطع کرنا چاہتے تھے۔ ان کا وطیرہ اس دوغلے کردار کی غمازی کرتا تھا۔ یعنی:

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

اپنی طرف سے ان کا یہ طریقِ کار نہایت مخفی اور رازدانہ تھا۔ لیکن قرآن ان کا منافقانہ نفسیات اور بزدلانہ روشِ زندگی کو بے نقاب کر رہا ہے کہ جب غلامانِ محمد ﷺ سے ملتے ہیں۔ تو انہیں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں یعنی ہم مسلمان ہیں اور سابقہ حالتِ کفر سے تائب ہو چکے ہیں۔ اور جب اپنے کفر کے رؤسا و قائدین کے پاس علیحدگی میں جاتے ہیں تو انہیں اپنی وفاداری اور کفر سے وابستگی کا یقین دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے راہ و رسم اور ملنا جلنا انہیں بے وقوف بنانے کے لیے ہے اور ان سے ہم جو اپنے مسلمان ہونے کا ذکر کرتے ہیں، وہ محض تمسخر اور استہزا ہے۔ یہ تھا ان کے کردار کا دوغلا پن جسے قرآن نے نمایاں طور پر انہی کے الفاظ میں واضح کر دیا۔

خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ کا مفہوم

اس آیت میں منافقین کے دو اقوال کا ذکر ہے ایک قولِ ایمان، جو وہ مسلمانوں سے کرتے تھے اور دوسرا قولِ کفر، جو وہ کفر کے سرغنوں سے کرتے تھے۔ پہلے قول کے لیے

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا. (۱)

''اور جب وہ (منافق) اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں۔''

کے الفاظ آتے ہیں، لیکن کفر کے قول کے لیے:

اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَکُمْ. (۲)

''جب اپنے شیطانوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں۔''

کے الفاظ آئے ہیں۔ خَلاَ فُلاَنٌ بفلانٍ کے معنٰی ہیں: وہ اس سے علیحدگی میں ملا، یا اس کے ساتھ خلوت میں ہوا۔(۳) یہاں اس امر کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے کہ منافقین کا قولِ کفر، خلوت میں ہوتا تھا۔ یعنی یہ ان کا باطن تھا۔ اور قولِ ایمان وہ ظاہر میں کرتے تھے۔ گویا ان کے ظاہر اور باطن میں تضاد تو تھا ہی لیکن اس کی یہ تھی کہ وہ ظاہراً ایمان، اسلام، نیکی اور اچھائی کی بات کرتے تھے لیکن ان کا باطن کفر اور بدی سے لبریز تھا۔ اسی نوعیت کے تضاد کو قرآن نے منافقت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایسا دائمی معیار ہے کہ ہر شخص اپنے ظاہر و باطن اور جلوت و خلوت کے تضاد کو پرکھ کر یہ متعین کرسکتا ہے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔

---

(۱) البقرہ، ۲: ۱۴

(۲) البقرہ، ۲: ۱۶

(۳) ابن منظور، لسان العرب، ۱۴: ۲۳۷

سازشی منصوبہ بندی منافقت کا بڑا گھناؤنا روپ ہے

اس آیت میں خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ کے دونوں الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ خَلَوْا کے لفظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اہلِ حق کے خلاف ساری سازشیں اور ریشہ دوانیاں خلوت میں مخفی اور سازشی انداز میں ہوتی تھیں۔ لوگ اہلِ حق کی مخالفت کھلے انداز میں نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے ان سے خوشامدانہ رویے سے پیش آتے تھے۔ ان کے سامنے ایسے کلمات بھی کہتے جن سے انہیں ظاہراً خوش کرنا مقصود ہوتا۔ ان کی تائید کرتے اور اپنے آپ کو ان کا ہمنوا ظاہر کرتے لیکن ان کے خلاف چھپ کر اپنی مخصوص مجلسوں میں سازشیں اور گھناؤنے منصوبے تیار کرتے رہتے تھے۔ منافقت کا یہ بیان اس حقیقت کی نشاندہی کررہا ہے کہ مخفی اور سازشی انداز کی کاروائیاں اور بند کمروں کے منصوبے سب اپنی اصل کے لحاظ سے منافقت ہوتے ہیں۔ اہلِ حق، سچائی کی بات کو ہر جگہ یکساں طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ اگر دینی تقاضے کے تحت کسی کی مخالفت میں بھی مخفی سازش کا عنصر کارفرما ہوتا۔

ہمارے معاشرے میں اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کے خلاف سازش کرنا اور مخفی طریقوں سے ایک دوسرے کی مخالفت کرنا ایک عمومی رویہ بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ مذہب کے کئی نام نہاد داعی بھی دوسروں کے خلاف سازش اور مخفی منصوبہ بندی (conspiracy, intrigue) میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ کسی کی مخالفت بھی کرتے ہیں تو چھپے انداز میں یہ منافقت بعض طبیعتوں میں اتنی عام ہوتی جارہی ہے کہ ان کا پورا کردار اسی عمل سے عبادت ہوکر رہ گیا ہے۔ طریقِ کار کے اعتبار سے یہ حق و باطل کے درمیان امتیاز ہے۔ آپ کسی بھی فرد، طبقے، گروہ یا جماعت کے طور طریقوں سے اس امر کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس کی بنیاد حق ہے یا منافقت کیونکہ قرآن کی یہ تعلیمات محض واقعات پر نہیں بلکہ ابدی اصولوں کے بیان پر مشتمل ہیں۔ اگر ہم اپنے خود تراشیدہ معیارات کے بجائے قرآنی معیارات پر جانچ کر حق و باطل کا تعین کریں تو بہت سی حقیقتیں بے نقاب ہوسکتی ہیں۔

سازشی سرغنے قرآنی اصطلاح میں شیطان ہیں

شیطان کا لفظ شطن سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں۔ اس لحاظ سے شیطان رحمت الٰہی سے دور اور محروم ہونے والے کو کہتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک شیطان، شاط یشیط سے فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی غضب میں جلنے کے ہیں۔ جو جلد باز، مشتعل مزاج، متمرد مزاج شریر و سرکش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کی مزید لغوی تحقیق اور معنوی تفصیلات و اطلاعات ہماری کتاب ''تسمیۃ القرآن'' کے حصے **أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر اس جگہ قرآنِ مجید نے گروہِ منافقین کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک منافقین اور دوسرے شیاطین۔

عام منافقین سے مراد وہ تمام لوگ تھے، جو زبان پر کلمہ اسلام اور دل میں کلمۂ کفر رکھتے تھے۔ جن کا ذکر اس آیت کے سیاق و سباق میں چلا آ رہا ہے۔ لیکن ان کی حیثیت محض کارکنوں کی تھی۔ کفر کے اصل سرغنے تو وہ سردار اور لیڈر تھے، جو محض مجلسیں سجا کر بیٹھتے اور مسلمانوں کے خلاف محض سازشیں کرتے تھے ان کو قرآنِ مجید نے ان کے گھناؤنے کردار کی بنا پر شیاطین قرار دیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کا عمل عام منافقوں سے کہیں زیادہ قبیح تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں شیطان کہا گیا ہے۔ یہ الفاظ منافقانہ اور سازشی کاروائیوں کی سرپرستی کرنے والے لیڈروں اور سرغنوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

تمسخر اور استہزاء کی نفسیات

مسلمانوں سے تمسخر اور استہزاء کی نفسیات بذاتِ خود منافقت ہے۔ غلط بیانی اور طعنہ زنی کا انداز بھی اسی میں شامل ہے۔ علامہ زمخشری نے استہزاء کا معنی إنزل الھوان والحقارۃ(۱) یعنی ذلت و حقارت کا وارد کرنا کیا ہے۔ کیونکہ استہزاء کی اصل ''ہزا'' ہے

(۱) زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، ۱: ۱۰۴

جس کے معنی کسی کا مذاق اڑانا کے ہیں۔ لہٰذا استہزاء کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے۔ ہنسنا محض ایک ذریعہ ہے جس سے تحقیر کی جاتی ہے۔ تحقیر کے بغیر ہنسنا استہزاء نہیں کہلاتا۔ یہاں منافقین کی مخصوص ذہنیت اور عادت کا ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کے پیشِ نظر مسلمانوں کی تذلیل وتحقیر تھی۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں لگے رہتے تھے۔ استہزاء ان کی اسی سوچ کا مظہر تھا۔ اس سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ وہ اہلِ حق کو حقیر اور خود کو اعلیٰ وفائق تصور کرتے تھے۔ اسی لیے تو ان کے نزدیک مسلمانوں کے استہزاء کا جواز نکلتا تھا۔ یہی سوچ بدقسمتی سے آج ہمارے ہاں حاوی ہوتی جارہی ہے بہت سے لوگ عامۃ المسلمین کو حقیر، بے وقعت اور ناسمجھ جان کر انہیں قابلِ التفات نہیں سمجھتے بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کا تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں۔ مستزاد یہ کہ کسی بھی معاشرے کے عوام کو اسی سوچ کے تحت حقیر جان کر نظر انداز کرنا از روئے قرآن مذموم اور علاماتِ منافقت میں سے ہے۔ اس بیان سے یہ تعلیم بھی حاصل ہوتی ہے کہ طنز، تمسخر اور استہزاء کا انداز عام گفتگو میں بھی ہرگز روا نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ بات اسلام کے آدابِ گفتگو کے صریح خلاف ہے۔ آدابِ گفتگو کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات بھی کہی جائے، اس کا منشاء و مراد اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے متضاد نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ کا استہزاء منافقوں کو ذلت و رسوائی کی سزا دینا ہے

اَللّٰہُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کے دو معنی ہیں اور یہاں فی الحقیقت دونوں ہی مراد ہیں۔ استہزاء کا لفظ اس آیت میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ پہلے منافقین کے فعل کے طور پر اور اب باری تعالیٰ کے فعل کے طور پر۔ اس حکمت کو سمجھنے کے لیے ایک اصول ذہن نشین کر لیجئے کہ جب بھی کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا درکار ہوتا ہے تو ظاہراً وہی فعل بولا جاتا ہے، جو انسانوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر دونوں استعمالات میں یہ فرق ہوتا ہے کہ چونکہ انسان ہر فعل میں ذرائع اور وسائط کا محتاج ہے۔ یعنی اس کا ہر فعل کسی نہ کسی ذریعے اور واسطے کی صورت میں اپنی غرض و غایت اور اصل مقصود کو پہنچتا ہے۔

جو اس فعل کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن باری تعالیٰ اپنے فعل میں کسی ذریعے کا محتاج نہیں ہے۔ اس لیے جب کوئی لفظ انسانی فعل کے بیان کے لیے بولا جائے گا تو اس میں ذریعہ اور مقصود دونوں شامل ہوں گے۔ مگر وہی لفظ باری تعالیٰ کے فعل کے بیان کے لیے بولا جائے گا تو اس سے مراد فعل کی صرف غرض یعنی نتیجہ مقصود ہوگا۔ ذریعہ نہ ہوگا مثلاً انسان دیکھتا ہے تو دیکھنے میں آنکھ اور روشنی کا محتاج ہے۔ اس لیے اس کے فعل میں یہ ذرائع بھی شامل ہوں گے۔ مگر جب یہ کہا جائے کہ اللہ دیکھتا ہے تو یہاں آنکھ، روشنی جیسے ذرائع نہیں بلکہ صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے، وہی مراد ہوگی۔ اسی طرح انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہوگا اور اصل مقصود جو سننے سے حاصل ہوتا ہے، مراد ہوگا۔ ایسے ہی انسان کا رحم یا غضب اس کے دل پر خاص حالت کے وارد ہونے کے ذریعے سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا رحم اور غضب، دل کی کیفیات کا نہیں، بلکہ صرف نتیجے کا نام ہے۔ یعنی معنی ''اللہ کے استہزاء'' کا ہے۔ جیسے کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ استہزاء میں اصل غرض دوسرے کی ذلت و رسوائی ہے اور ہنسنا محض ذریعہ ہے۔ لہٰذا اللہ کے استہزاء میں دراصل غرض، مقصود اور نتیجہ باقی رہ گیا۔ اور ہنسنا جو ذریعہ تھا، وہ مفقود ہوگیا۔ کیونکہ اللہ اس سے پاک ہے۔ چنانچہ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ کا معنی یہ ہوگا کہ ''اللہ تعالیٰ ان منافقین کو ذلیل و رسوا کرے گا ان کے استہزاء کے بدلے میں جو وہ اہل ایمان سے کرتے ہیں۔''

سزائے فعل کا ذکر اسی فعل سے کرنا اسلوبِ قرآن ہے

عربی زبان بلکہ خود قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ بعض اوقات کسی فعل پر دی جانے والی سزا کا ذکر بھی اسی فعل کے انداز میں کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ وہ لفظ فعل کے مفہوم پر امام ابن جریرؒ کہتے ہیں کہ جب ایک ہی فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ اس فعل کی سزا ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ج فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللهِ ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ o(۱)

''اور برائی کا بدلہ اسی برائی کی مِثل ہوتا ہے، پھر جس نے معاف کر دیا اور (معافی کے ذریعہ) اصلاح کی تو اُسکا اجر اللہ کے ذمّہ ہے۔ بے شک وہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتاo''

حالانکہ سزا تو عدل و انصاف کا عین تقاضا ہوتی ہے بری نہیں ہوتی، اسی طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ط فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ o(۲)

''حرمت والے مہینے کے بدلے حرمت والا مہینہ ہے اور (دیگر) حرمت والی چیزیں ایک دوسرے کا بدل ہیں، پس اگر تم پر کوئی زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو مگر اسی قدر جتنی اس نے تم پر کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہےo''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ o(۳)

''اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں (ہاں) مگر حد

(۱) الشوریٰ، ۴۲: ۴۰
(۲) البقرۃ، ۲: ۱۹۴
(۳) البقرہ، ۲: ۱۹۰

سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا٥‘‘

اسی طرح باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط أُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ٥ (۱)

’’اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھلا بیٹھے پھر اللہ نے اُن کی جانوں کو ہی اُن سے بھلا دیا (کہ وہ اپنی جانوں کے لیے ہی کچھ بھلائی آگے بھیج دیتے)، وہی لوگ نافرمان ہیں٥‘‘

ایک مقام پر منافقین کا نام لے کر یہی بات یوں کہی گئی ہے:

اَلْمُنٰفِقُونَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ ط نَسُوا اللهَ فَنَسِيَهُمْ ط إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ هُمُ الْفٰسِقُونَ٥ (۲)

’’منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے (کی جنس) سے ہیں۔ یہ لوگ بری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے) بند رکھتے ہیں، انہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر دیا، بے شک منافقین ہی نافرمان ہیں٥‘‘

حالانکہ خدا کی ذات بھولنے بھلانے سے پاک ہے۔ لیکن منافقین کے بھلانے پر جو سزا دی گئی ہے اس کو بھلانے سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ استہزاء سے پاک ہے۔ لیکن منافقین کے استہزاء پر جو سزا دی گئی اس کو بھی استہزاء سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ امام راغبؒ نے ’’مفردات ألفاظ القرآن (ص: ۵۴۳)‘‘ میں اور ابن منظور نے ’’لسان

(۱) الحشر، ۵۹: ۱۹

(۲) التوبة، ۹: ۶۷

العرب (۱: ۲۸۳)'' میں اسی معنی کی تائید کی ہے۔ علامہ قرطبیؒ کے بیان سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔(۱) صاحبِ جلالین اسی کا معنی **یُجَازِیهم باستهزائهم** (اللہ تعالیٰ ان کے مذاق پر انہیں سزا دیتا ہے) کرتے ہیں۔(۲) محاورۂ عرب کا استعمال بھی اسی معنی کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے کفار و مشرکین اس آیت کے نازل ہونے پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ اہل علم پر نہایت اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ قرآن و حدیث میں ایسے الفاظ کے استعمالات پر تحقیق کر کے صحیح ترجمہ اور مفہوم بیان کیا کریں تا کہ عربی زبان سے نا آشنا لوگ ان کے تساہل کی بنا پر کسی غلط خیالی یا بد اعتقادی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

بعض منصوبوں کا کچھ دیر تک قائم رہنا ان کے حق ہونے کی دلیل نہیں

مَدَّ یَمُدُّ کے اصل معنی کھینچنا اور پھیلانا کے ہیں۔(۳) اس میں ''اِمْهَال'' یعنی مہلت اور ڈھیل کا مفہوم پایا جاتا ہے جب کوئی شخص خدا کے خلاف بغاوت اور سرکشی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اسی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا اسے ڈھیل اور مہلت دیتے ہیں کہ چاہے تو کسی وقت بھی تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لے یا پھر اپنی گمراہی اور سرکشی کی انتہا کو پہنچ جائے تا کہ اس کی رسی دراز کیے رکھنے کے بعد اس کی گرفت ہو تو اتنی ہی شدید ہو جتنی شدید اس کی سرکشی اور بغاوت تھی۔ اس آیت سے لوگوں کے اپنے اعمال اور گمراہی و سرکشی کی راہ اختیار کرنے کی نسبت اللہ کی طرف سے عطا کردہ آزادی اور اختیار بھی ثابت ہوتا ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کسی کو غلط راہ پڑنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ اور نہ غلط کاری کے بعد مہلت دیے بغیر کسی کی گرفت کرتے ہیں۔ چنانچہ منافقین کو بھی عہد رسالت میں ڈھیل دی گئی حتی کہ غزوۂ تبوک کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک کے آخری ایام

(۱) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۱: ۲۵۳
(۲) سیوطی، تفسیر الجلالین: ۵
(۳) ابن منظور، لسان العرب، ۳: ۳۹۶

میں انہیں سزا دی گئی۔

یہاں تعلیم و تربیت کا یہ پہلو مضمر ہے کہ اگر اس دنیا میں کسی شریر و سرکش کو اپنی منفی اور تخریبی کاروائیاں جاری رکھنے کا کچھ موقعہ ملا رہے اور اس کے منصوبے کچھ عرصے تک قائم رہیں تو اس سے یہ مطلب نہ اخذ کیا جائے کہ وہ حق ہے کیونکہ باطل ہوتا تو نیست و نابود ہوجاتا۔ اور نہ یہ مراد لیا جائے کہ وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اسے زوال نہیں آسکتا۔ یہ سب انسان کی ناقص عقل کی بھول ہے۔ حقیقت میں یہ مہلت نہ اس کی حقانیت کی علامت ہے اور نہ اس کے ہمیشہ باقی رہنے کی دلیل۔ اس میں اس کی کوئی کامیابی نہیں اسے اس مہلت پر خوش نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ باری تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے تاکہ وہ اپنی گمراہی کے نقطۂ عروج پر پہنچ جائے تو اس تصور کو **یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ** (انہیں ڈھیل دیتا ہے (تاکہ وہ خود اپنے انجام تک جا پہنچیں) سو وہ خود اپنی سرکشی میں بھٹک رہے ہیں) کے الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

طغان کا مفہوم

طغی سے مشتق ہے۔ اس کے معانی نافرمانی میں حد سے گزر جانے کے آتے ہیں۔[1] اسی لیے اس کا ترجمہ سرکشی اور بغاوت کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا:

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰیo[2]

"تم فرعون کے پاس جاؤ وہ (نافرمانی و سرکشی میں) حد سے بڑھ گیا ہےo"

یعمھون کا مفہوم

عَمَّهُ کے معنی ہیں:

(۱) ابن منظور، لسان العرب، ۱۵: ۷
(۲) طه، ۲۰: ۲۴

التردد في الأمر من التحير.[۱]

”تحیر کی وجہ سے کسی معاملے میں متردد ہونا۔“

علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ یہ لفظ عمی کی مانند ہے مگر فرق یہ ہے کہ عمی، اندھا پن، ظاہری نابینائی اور عقل وفکر یا رائے کی نابینائی دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن **عمه** صرف عقل وفکر کی یعنی باطنی نابینائی پر استعمال ہوتا ہے۔[۲] اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی نافرمانی کے باعث ایسے لوگ باطنی روشنی اور صحیح فکری رہنمائی سے محروم ہوجاتے ہیں اور ہمیشہ اپنی گمراہی و سرکشی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ تاوقتیکہ اپنے تمرد اور بغاوت سے تائب ہوجائیں یا بدبختی میں اس انتہا کو پہنچ جائیں کہ پھر ان پر عذاب الٰہی کی گرفت اتنی سخت ہو کہ وہ دوسروں کے لیے عبرت بن جائے۔

اشتراء، اشتروا کا مفہوم

شری سے ہے۔ شراء کے معنی عموماً خریدنے اور بیع کے معنی بیچنے کے آتے ہیں۔ مگر کسی چیز کے عوض چیز لی جارہی ہو تو بیع و شریٰ دونوں ایک دوسرے کے مترادف بن جاتے ہیں۔[۳] ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ کفار و منافقین نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔ یعنی انہوں نے ایمان کے بجائے کفر کو پسند کیا۔ اس لحاظ سے یہاں اِشۡتَرَوا بمعنی اِسۡتَحَبُّوۡا استعمال ہوا ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے اسی معنی کی تائید کی ہے۔[۴] اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تو اپنی سابقہ کفر کی حالت کی بنا پر پہلے ہی دولت ایمان اور متاع ہدایت سے محروم تھے۔ وہ ہدایت دے کر گمراہی خریدنے کے قابل تو تب ہوتے اگر ان کے پاس پہلے متاع ہدایت موجود ہوتی۔ انہیں تو اب ہدایت کی راہ بتائی جا

(۱) اصفہانی، مفردات ألفاظ القرآن: ۱۰۱۳

(۲) زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، ۱: ۱۰۷

(۳) ابن منظور، لسان العرب، ۱۴: ۴۲۷

(۴) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۱: ۲۲۵

رہی تھی۔ اب ان کے سامنے دو راستے تھے: ایک ہدایت کا، دوسرا گمراہی کا، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِo(۱)

''اور ہم نے انہیں دو راستے دکھا دیے (یا وہ ہدایت قبول کر کے راہِ سنت پر آجاتے یا اپنی گمراہی وضلالت پر قائم رہتے)o''

چنانچہ انہوں نے ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کو ترجیح دی اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کیا۔ ان کے اس فیصلے کو باری تعالیٰ نے اِشْتَرَوُ الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِشْتَرَوُ الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى کا دوسرا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس فطری ہدایت کو۔ جو اس نے ہر انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اسے ودیعت کردی ہے، دے کر۔ اس کے بدلے کفر اور گمراہی حاصل کرلی۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰىo(۲)

''(موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا: ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو (اس کے لائق) وجود بخشا پھر (اس کے حسبِ حال) اس کی رہنمائی کیo''

چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی بنا پر اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ (سب) بول اٹھے کیوں نہیں؟)(۳) کے ابدی وعدہ کا شرف بھی حاصل کرچکا ہے۔ لہٰذا اسے فطری ہدایت کا وہ بلند درجہ نصیب ہوا ہے جو کسی اور ارضی مخلوق کو میسر نہیں آسکا۔ اس لیے ان کے پاس نسل بنی آدم ہونے کے باعث فطری ہدایت

(۱) البلد، ۹۰: ۱۰

(۲) طٰه، ۲۰: ۵۰

(۳) الأعراف، ۷: ۱۷۲

کی قیمتی متاع تو موجود تھی۔ جس کا تقاضا یہ تھا کہ اب وہ ہدایت ربانی پر بھی ایمان لے آتے۔ لیکن انہوں نے فطری ہدایت کی یہ بیش بہا متاع دے کر اس کے بدلے گمراہی و ضلالت کا سودا کرلیا۔ فطری ہدایت کو کسبی گمراہی سے بدل لینے کے اس فعل کو قرآن حکیم نے إشتراء یعنی إستبدال الضلالة بالھدیٰ (ہدایت کے بدلے گمراہی کو اپنایا)(۱) قرار دیا ہے۔ علامہ زمخشری نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے۔ کہ اُنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کس طرح خریدی، حالانکہ وہ تو پہلے بھی ہدایت پر نہ تھے۔ لکھا ہے:

لأن الدين القيّم هو فطرة الله التی فطر الناس علیها، فكل من ضل فهو مستبدل خلاف الفطرة.(۲)

’’کیونکہ دین حق ہی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تخلیق کیا ہے۔ پس ہر گمراہ شخص فی الحقیقت فطرت کی ہدایت کو ضلالت و گمراہی سے بدلنے والا ہے۔‘‘

اس تصور کی بنا پر گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدنے کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ جمہور مفسرین نے اسی معنی کو اپنایا ہے۔

منافقت سراسر گھاٹے کا سودا ہے

انہوں نے منافقت کا وطیرہ اس لیے اپنایا تھا کہ دونوں طرف سے مفادات حاصل کرسکیں گے۔ وہ کفر سے اپنا دیرینہ تعلق قائم رکھنے کی بناء پر ادھر سے حاصل ہونے والے مفادات کو بھی ملحوظ رکھتے چاہتے تھے اور مسلمانوں سے ایمان کا تعلق ظاہر کر کے ادھر سے دنیوی منافع، اموال غنیمت اور دیگر مفادات کے حق دار بنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی توقعات پوری نہ ہوسکیں۔ چونکہ ان کی منافقت خدا اور رسول سے مخفی نہ تھی۔ اس لیے وہ ہر

(۱) شوکانی، فتح القدیر، ۱: ۴۱۵

(۲) زمخشری، الکشاف عن حقائق غدامض التنزیل، ۱: ۱۰۷

ایک کے سامنے بے نقاب ہوگئے۔ یوں دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی ان کے حصے میں آئی اور آخرت میں اذیت ناک عذاب کے مستحق قرار دیے گئے۔ ان کی یہ تجارت کسی لحاظ سے بھی سودمند اور نفع بخش ثابت نہ ہوئی۔ یہ سودا بجائے منفعت کے خود انہی کے حق میں مضرت اور نقصان کا باعث ہوگیا جو ''رأس المال'' فطری ہدایت کی صورت میں ان کے پاس موجود تھا، وہ بھی گمراہی کے بدلے ضائع کر بیٹھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہدایت کے باعث جو فائدہ انہیں آخرت کی زندگی میں پہنچتا، وہ اس سے بھی محروم ہوگئے اور دین کی زندگی میں بھی مزعومہ مفادات پورے نہ ہوسکے۔ قرآن حکیم نے یہ دونوں امور اس طرح بیان کئے ہیں: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ کہ ان کی تجارت نے نہ انہیں دنیا کا نفع پہنچایا، وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ اور نہ ہدایت یعنی آخرت کا نفع نصیب ہوسکا۔ اس آیت کریمہ نے منافقت کو صریح نقصان اور گھاٹے کا سودا قرار دیا ہے اور تنبیہہ کی ہے کہ کردار کا دوہرا پن کبھی بھی مطلوبہ مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کا نتیجہ بہر صورت ذلت و رسوائی ہے خواہ جلد ہو یا بدیر۔ یہاں وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ کا معنی یہ بھی ہے کہ جنھوں نے حصول منفعت کی خاطر ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی وہ فی الحقیقت تجارت کی صحیح راہ نہیں جانتے۔ اگر انہیں صحیح سوجھ بوجھ اور نفع ونقصان کی تمیز ہوتی تو کبھی نقصان کا سودا نہ کرتے۔

ایک گروہِ منافقین کی مثال

مجموعی طور پر منافق دو قسم کے تھے: ایک وہ جو دل سے کفر ہی پر قائم تھے اور صرف زبان کی حد تک دعویٰ ایمان کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تعصب اور عناد کی بنا پر اسلام کو سرے سے قبول ہی نہ کیا تھا۔ گویا یہ قطعی منکر تھے۔ دوسرے جو ایمان تو قبول کرتے تھے لیکن اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے گھبرا کر اور اپنے مزعومہ مفادات کو معرض خطر میں دیکھ کر پھر اسلام سے دستبردار ہوجاتے۔ ان کا دل ایمان لانے کے لیے تیار ہوتا مگر ہمیشہ مفادات اور خطرات آڑے آجاتے۔ گویا یہ تذبذب اور شک کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ اس آیت میں پہلے گروہ کی تمثیل بیان کی گئی ہے اور دوسرے گروہ

کی تمثیل آگے آیت نمبر ۱۹ میں آ رہی ہے۔ اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے حق کی آگ روشن کی اور اس کے نور سے سارا گرد ونواح منور ہوگیا۔ ہمارے خیال میں اس سے مراد جناب سرور کائنات ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

مثلي (و مثل الناس) کمثل رجل استوقد نارا.(۱)

''میری اور لوگوں کی مثال اس شخص کی مانند ہے جس نے آگ جلائی۔''

آپ ﷺ نے اسلام کے پیغام اور نور تبلیغ سے زندگی کے تمام ماحول کو روشن کردیا۔ حق کو باطل سے، خیر کو شر سے اور نیکی کو بدی سے نمایاں کردیا۔ وہ ماحول حیات جو شب تاریک کی مانند ظلمتوں اور گمراہیوں کا گہوارہ تھا، حضور ﷺ کے مہیا کردہ نور ہدایت سے چمک اٹھا اور ہر طرف پیغام حق کا اجالا ہوگیا جو اہل نظر اور ارباب دانش تھے، ان پر ساری حقیقتیں آشکار ہوگئیں۔ لیکن منافق جو ہوا و ہوس کی پرستش میں سب سے آگے جا چکے تھے، باوجود روشنی کے حقیقت کو نہ پاسکے۔ انہوں نے اس نور ہدایت کو ٹھکرا دیا اور تعصب و عناد کے پردے اٹھا کر حق وصداقت کا روشن چہرہ دیکھنے سے انکار کردیا۔ جب انہوں نے از خود گمراہی کو ہدایت پر ور ظلمت کو روشنی پر ترجیح دی اور نور حق سے منہ پھیر کر کفر وضلالت کی تاریکیوں کو پسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نور بصارت سلب کرلیا۔ یعنی انہیں حسب خواہش گمراہیوں اور ظلمتوں میں بھٹکتے رہنے کی توفیق دے دی۔ جنہوں نے اس نور سے اکتساب فیض کیا تھا، وہ منزل مراد کو پاگئے۔ اور جو اس کے منکر ہوئے تھے، وہ کفر کی ظلمات میں بھٹکتے رہے۔

صُمٌّ اصم کی جمع ہے،(۲) بُکْمٌ اَبْکَم کی جمع ہے،(۳) اور عمیٌ اَعْمٰی کی جمع

(۱) بخاري، الصحیح، کتاب الأنبیاء، باب قول اللہ تعالی ووھبنا لداود سلیمان نعم العبد، ۲: ۱۲۶۰، رقم: ۳۲۴۴

(۲) ابن منظور، لسان العرب، ۱۲: ۳۴۲

(۳) ابن منظور، لسان العرب، ۱۲: ۵۳

ہے۔[۱] ان کے معانی بالترتیب گونگا، بہرا اور اندھا کے ہیں۔ ان کی گمراہی اور قبول حق سے انکار کا یہ عالم ہے کہ ان کے کان حق کی بات سننے سے قاصر ہیں۔ ان کی زبانیں حق کہنے سے عاری ہیں اور ان کی آنکھیں حق کو دیکھنے سے محروم ہیں۔ یہاں مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے مذکورہ تمثیل کی وضاحت میں خوب نکتہ بیان کیا ہے:

> ''جنہوں نے اِظہارِ ایمان کیا اور دل میں کفر رکھ کر اِقرار کی روشنی کو ضائع کردیا اور وہ بھی جو مومن ہونے کے بعد مرتد ہوگئے اور وہ بھی جنہیں فطرتِ سلیمہ عطا ہوئی اور دلائل کی روشنی نے حق واضح کردیا مگر انہوں نے فائدہ نہ اٹھایا اور گمراہی اختیار کی۔ اور جب حق سننے، ماننے، کہنے اور راہِ حق دیکھنے سے محروم ہوئے تو کان، زبان، آنکھ سب بے کار ہیں۔''[۲]

دوسرے گروہِ منافقین کی مثال

اس جگہ منافقین کی دوسری قسم کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ یہاں بطور تمثیل کچھ الفاظ کا ذکر آیا ہے۔ ان کے مرادی معنی سمجھنے سے پہلے لغوی معنی پر توجہ کرلیں۔

صیب صوب سے مشتق ہے۔ صواب فی نفسہٖ پسندیدہ امر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ صوب یا صیب ایسی بارش کو کہا جاتا ہے جو فائدہ مند ہو۔ صیب خود ایسے بادل کو بھی کہتے ہیں۔[۳]

السماء ہر چیز کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں چنانچہ یہ لفظ محض بلندی پر بھی بولا جاتا ہے۔ سماء کے لفظ کا اطلاق زمین پر پڑنے سے پہلے بارش پر بھی ہوتا ہے اور سماء کے معنی خود ''سحاب'' یعنی بادل کے بھی ہیں۔[۴]

(۱) ابن منظور، لسان العرب، ۱۵: ۹۵

(۲) نعیم الدین مراد آبادی، خزائن العرفان: ۷۹۸

(۳) ابن منظور، لسان االعرب، ۱: ۵۳۷

(۴) زبیدی، تاج العروس، ۱: ۲۴۲

الصواعق صاعقہ کی جمع ہے اور صعق سے مشتق ہے۔ صاعقہ اس ہولناک آواز کو کہا جاتا ہے جو گرج اور کڑک سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بعض اوقات آگ، موت اور عذاب بھی مراد لیے جاتے ہیں۔[1] لیکن امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

فهو أشياء حاصلة من الصاعقه هي الصوت الشديد من الجو، وهي في ذاتها شئ واحد، وهذه لأشياء تاثيرات مِنها.[2]

''یہ سب چیزیں فی الحقیقت صاعقہ کے نتائج اور تاثیرات ہیں۔ صاعقہ محض ہولناک آواز ہی کا نام ہے جو گرج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے زلزلے اور آندھی میں جو ہولناک آواز آتی ہے۔ اس پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔''

اس تمثیل میں آسمان سے برسنے والی بارش سے مراد وحی الٰہی کا نزول یا اسلام ہے۔ جو عالم انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا اندھیروں سے مراد وہ مصائب و مشکلات ہیں جنھوں نے ہر طرف سے اسلام کو گھیر رکھا تھا۔ گرج اور کڑک سے مراد اسلام کی پے در پے فتوحات اور کامیابیاں ہیں جو باوجود مشکلات اور نامساعد حالات کے مطلع کو روشن کر رہی تھیں اور ان کے باعث اہل اسلام کے دلوں کو تقویت پہنچ رہی تھی۔

اسلام بلا شک و شبہ رحمت حق کی بارش بن کر مردہ دلوں کو تازہ زندگی عطا کرتا ہے۔ جس طرح زوردار بارش کے وقت بسا اوقات تیز آندھیاں اور گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور بادل کی ہولناک کڑک سے دل ہلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کی آمد کے ساتھ ہی باطل اور کفر و طاغوت کی طرف سے کھلی عداوتوں اور پوشیدہ سازشوں کا لامحدود سلسلہ جاری ہوگیا۔ اہل حق کی راہ میں طرح طرح کی مخالفتیں اور مزاحمتیں کھڑی ہوگئیں۔ مصائب و آلام کے بادل گرجنے لگے۔

(۱) ابن منظور، لسان العرب، ۱۰: ۱۹۸

(۲) اصفهانی، مفردات ألفاظ القرآن: ۲۸۱

ان تمام ہولناکیوں نے مل کر عجیب وحشت کا سماں پیدا کر دیا جنہوں نے صدق دل سے نور ہدایت کو قبول کرلیا تھا۔ وہ ظاہراً ان ناسازگار حالات میں بھی ثابت قدم رہے۔ کوئی مصیبت اور مخالفت بھی ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کرسکی۔ لیکن جو لوگ نیم دلی اور بزدلی کا شکار تھے۔ جن کی کیفیت تذبذب اور تحریص کی تھی، وہ اسلام کی حیات بخشی اور نفع مندی سے بھی متمتع ہونا چاہتے تھے لیکن دردمنانہ جرات و ہمت کے فقدان کے باعث مصائب و آلام کی تاریک گھٹاؤں کو دیکھ کر خوف زدہ ہوجاتے اور شدید مخالفت و مزاحمت کی ہولناک آوازوں کو سن کر ان کے دل ہل جاتے تھے۔ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر گویا وہ ان پریشان کن کیفیات سے لاتعلقی ظاہر کرتے تھے۔ یوں اسلام سے وابستگی منقطع کرنے میں وہ اپنی عافیت تصور کرتے تھے۔

یہاں ان کے حسد کی کیفیت بیان کی جارہی ہے۔ چونکہ مذکورہ بالا تمام مشکلات کے باوجود اسلام کو روز بروز ترقی اور فتح و کامرانی نصیب ہو رہی تھی۔ جنگوں میں فتوحات ہوتیں۔ اہل حق کے ہاتھ اموال غنیمت آتے۔ ان کی مالی حیثیت بھی مستحکم ہوتی اور سیاسی و معاشرتی بھی اور اس طرح لمحہ بہ لمحہ اسلام ایک عالمگیر قوت بنتا جا رہا تھا۔ جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی تو وہ حیران و ششدر رہ جاتے۔ اور اسلام کی فتح و کامرانی کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جل اٹھتے۔ ان کی اسی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کی فتوحات کی چمک اور دمک کہیں ان حاسدوں کی آنکھوں کی بینائی ہی سلب نہ کرلے۔ ان کامیابیوں کی روشنی کو دیکھ کر انہیں اسلام کا راستہ آسان نظر آنے لگتا تو وہ مفاد پرستی اور دنیوی منفعت کی خاطر مسلمانوں کے ساتھ ہوجاتے اور ان کے ہمراہ اسلام کی منزل کی طرف بڑھنے لگتے۔ لیکن اسی اثنا میں جنگ و قتال اور ایثار و قربانی کا کوئی مرحلہ آجاتا تو مشکلات کی تاریکیوں میں وہی رک جاتے اور خطرات دیکھ کر مسلمانوں کو پھر چھوڑ جاتے۔ یہ تھا ان کا مفاد پرستانہ طرز عمل، کہ ظاہری منافع و مفادات کے حصول کی امید لگتی تو فائدہ اٹھانے کے لیے اہل حق کے ساتھ ہوجاتے خطرات و مصائب کے لمحات میں قربانی کا

وقت آتا تو فوراً لاتعلق ہو جاتے۔

لَوْ حرف شرط ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا گیا:

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۱)

’’اگر ہم کوئی کھیل تماشا اختیار کرنا چاہتے تو اسے اپنی ہی طرف سے اختیار کر لیتے اگر ہم (ایسا) کرنے والے ہوتے۔‘‘

یہ انداز کسی خلاف مشیت امر کے بیان کے لیے اپنایا جاتا ہے۔ اس بیان کا مقصود مذکورہ امر کی نفی ہوتا ہے۔

شَاءَ مَشِيْئَةٌ کسی چیز کو وجود میں لانے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کسی شے کی ایجاد ہے۔ جب کہ انسان کی مشیت ’’اصابة الشيی‘‘ یعنی کسی شے کے ارادے کا نام ہے۔ ’’شی‘‘ اصل میں ’’شَاءَ‘‘ کا مصدر ہے جو بمعنی مفعول استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں ’’جو چیز چاہی گئی‘‘ یعنی جس چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا گیا۔ بعض علماء کے نزدیک شی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو جانی جائے اور جس چیز کی خبر دی جائے۔ مايصح إن يعلم و يخبر عنه۔ (۲)

یہاں اللہ تعالیٰ یہ واضح فرما رہے ہیں کہ اگر میں چاہتا تو پہلے گروہ کی طرح ان کی بصارت اور سماعت بھی سلب کر لیتا۔ اور اسلام کی طرف وقتی طور پر راغب ہونے کی بھی توفیق نہ ملتی۔ لیکن یہ مشیت الٰہی کے خلاف ہے۔ جو شخص جس قدر سننے اور دیکھنے کے لیے تیار ہو، اسے اسی قدر توفیق مرحمت فرمائی جاتی ہے۔ اس پر ذات حق اپنے فیصلے سے کسی قسم کا جبر وارد نہیں کرتی۔ پہلے گروہ نے نور ہدایت قبول کرنے سے کھلا انکار کر دیا تھا۔ اور انہوں نے تعصب کا پردہ اٹھا کر اسلام کی حقانیت کو دیکھنا ہی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس لیے

---

(۱) الأنبياء، ۲۱: ۱۷

(۲) زمخشری، الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل، ۱: ۳۵۲

ہم نے بھی انہی کے حسب خواہش اور حسب عمل انہیں نور بصارت سے محروم کر دیا۔ یعنی انہیں توفیق ہدایت سے دور کر دیا لیکن دوسرا گروہ کبھی مفادات کی خاطر اور کبھی عظمت اسلام سے مرعوب ہوکر، الغرض کچھ نہ کچھ اور کبھی نہ کبھی تو اسلام کے قریب آتا ہی ہے۔ ہر چند کہ پھر خطرات سے گھبرا کر دور چلا جاتا ہے۔ اس لیے اس نے اسلام کی خاطر جس حد تک اپنے دیدہ و گوش کھول رکھے ہیں۔ ہماری مشیت و حکمت کا یہ تقاضا نہیں کہ انہیں ان سے بھی محروم کر دیا جائے۔ یہ بیان باری تعالیٰ کے عدل و انصاف اور انسانی اعمال میں اس کی آزادی اور اختیار پر کھلی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے مزید برآں اس میں حق کی دعوت دینے والوں کو یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ جو لوگ جس حد تک اور جس حال میں بھی حق کے قریب آنا چاہیں، انہیں اس سے روکا نہ جائے۔ ممکن ہے اسلام اور حق سے قرب کے باعث ان کی مفاد پرستی رفتہ رفتہ حق پرستی میں بدل جائے اور وہ منافقت سے تائب ہوکر بالآخر سچے مسلمان بن جائیں۔ لہٰذا یہ کہہ کر کہ یہ لوگ مفادات کے پیش نظر حق کے قریب آ رہے ہیں انہیں دور کر دینا، درحقیقت ان کے لیے حق کو صدق دل سے قبول کرنے کے امکانات کو معدوم کرنے کے مترادف ہے۔

قدیر کا مفہوم

قدرت سے ہے یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کے عجز یا کمزوری کی نفی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قَدِیُر کے معنی اصطلاح شرع میں یوں بیان کیے گئے ہیں:

> الفاعل لما يشاء على قدر ما تقتضِي الحكمة لا زائداً عليه ولا ناقصا عنه.[1]

> ''اس کام کا کرنے والا جسے وہ چاہے اسی قدر حکمت کا تقاضا ہے نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔''

(۱) اصفہانی، مفردات ألفاظ القرآن: ۱۱۶۴

لہٰذا خدا کے قادر مطلق ہونے کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ ایسے کام اس کی قدرت کی طرف منسوب کئے جائیں جو اس کی حکمت اور مشیت کے خلاف ہوں کیونکہ قدرتِ الٰہی کے تصور میں اس کی ''حکمت اور مشیت'' بھی شامل ہیں۔ پس شریعت اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر ہونے کا یہ مفہوم ہے کہ ''وہ ذات ہر وہ کام کرسکتی ہے جو وہ چاہے یعنی جو اس کی مشیت کو مطلوب ہو اور اس حد تک کرسکتی ہے جس حد تک اس کی حکمت کا تقاضا ہو۔ اس معاملے میں وہ نہ محتاج ہے اور نہ عاجز و کمزور لیکن جو امور اور افعال اس کی شانِ الوہیت اور مشیت و حکمت کے منافی ہوں، ان کا کرنا نہ وہ چاہتی ہے اور نہ اس کی حکمت کا مقتضٰی ہوتا ہے اس لیے ان کے حوالے سے اس کی قدرت مطلقہ کا بیان کرنا قطعاً نامناسب بلکہ اس کے قدیر ہونے کے خلاف ہے۔

خلاصۂ بحث

سورۃ البقرۃ کی آیات ۸ تا ۲۰ میں منافقین کی علامات کا مسلسل بیان کیا گیا ہے جن کا تفصیلی ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا خلاصہ دوبارہ بیان کیا جاتا ہے:

- دعویٰ ایمان صرف زبانی حد تک کرنا اور باطن کا اس کی تصدیق سے خالی ہونا۔
- محض توحید و آخرت پر ایمان کو کافی سمجھنا اور رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان اس قدر ضروری نہ سمجھنا۔
- دھوکہ دہی اور مکر و فریب کی نفسیات
- یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہماری حالتِ نفاق سے بے خبر ہیں۔
- یہ سمجھنا کہ ہم اپنی مکاریوں، حیلہ سازیوں اور چالاکیوں سے دوسروں کو فریب

دینے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

- قلب و باطن کا بیمار ہونا
- جھوٹ بولنا
- نام نہاد اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی یعنی مفسدانہ طرزِ عمل کے باوجود خود کو صالح اور مصلح سمجھنا
- دوسروں کو بے وقوف اور صرف خود کو اہلِ عقل و دانش سمجھنا۔
- امت مسلمہ کی اکثریت کو گمراہ تصور کرنا
- اجماع امت یا سوادِ اعظم کی پیروی نہ کرنا
- کردار کا دوغلا پن اور ظاہر و باطن کا تضاد
- اہل حق کے خلاف مخفی سازشیں اور تخریبی منصوبے تیار کرنا
- اہل حق کے استہزاء کی نفسیات
- مسلمانوں پر طنز، طعنہ زنی اور ان کی تحقیر و تمسخر کے درپے ہونا
- باطل کو حق پر ترجیح دینا
- سچائی کو روشن دیکھتے ہوئے بھی اس سے آنکھیں بند کر لینا
- تنگ نظری، تعصب اور عناد میں اس حد تک پہنچ جانا کہ کان، حق سن نہ سکیں، زبان حق کہہ نہ سکے اور آنکھیں، حق دیکھ نہ سکیں۔
- اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے گھبرانا اور ان سے بچاؤ کی تدابیر کرنا
- اہل حق کی کامیابیوں پر دنگ رہ جانا اور ان پر حسد کرنا

- مفاد پرستانہ طرزِ عمل یعنی مفادات کے حصول کے لیے اہل حق کا ساتھ دینا اور خطرات و مصائب میں قربانی سے گریز کرتے ہوئے ان سے علیحدہ ہوجانا
- حق کے معاملے میں نیم دلی اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا رہنا۔

یہ قرآن مجید کا وہ پہلا چارٹ ہے، جہاں منافقت کی علامات کو واضح طور پر گنوایا گیا ہے ہم نے انہیں تفصیل اور نظم و ضبط کے ساتھ اس لیے قلمبند کردیا ہے کہ ان کے مطالعہ سے باقاعدہ طور پر ہر شخص اپنے احوال اور معاملات کا جائزہ لے سکے۔ اور ان کی روشنی میں اپنی اصلاح کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان اور اسلام میں کامل اخلاص عطا فرمائے۔

(آمین بجاہِ سید المرسلین ﷺ)

www.MinhajBooks.com

مآخذ و مراجع

۱۔ القرآن الحکیم۔

۲۔ **احمد بن حنبل**، ابو عبد اللہ بن محمد (۱۶۴۔۲۴۱ھ/۷۸۰۔۸۵۵ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء۔

۳۔ **اصفہانی**، ابو قاسم حسین بن محمد راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ/ ۱۱۰۸ء)۔ **مفردات ألفاظ القرآن**۔ دمشق، شام: دار القلم + بیروت، لبنان: الدار الشامیہ، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء۔

۴۔ **اقبال**، علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء)۔ **کلیات**۔ لاہور، پاکستان: شیخ غلام نبی اینڈ سنز، ۱۹۸۹ء۔

۵۔ **بخاری**، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴۔۲۵۶ھ/ ۸۱۰۔۸۷۰ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان + دمشق، شام: دار القلم، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء۔

۶۔ **بغوی**، ابو محمد حسین بن مسعود بن محمد (۴۳۶۔۵۱۶ھ/ ۱۰۴۴۔۱۱۲۲ء)۔ **معالم التنزیل**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفۃ، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۷۔ **ترمذی**، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی (۲۱۰۔۲۷۹ھ/ ۸۲۵۔۸۹۲ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹۸ء۔

۸۔ **جرجانی**، علی بن محمد بن علی، سید شریف (۷۴۰۔ ۸۱۶ھ)۔ **التعریفات**۔ کراچی، پاکستان: مکتبہ حمادیہ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۹۔ **ابن ابی حاتم**، عبد الرحمن بن ابی حاتم محمد بن ادریس ابو محمد الرازی التمیمی

(۳۲۷ھ)۔ تفسیر القرآن العظیم۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، ۱۲۷۱ھ۔

۱۰۔ حاکم، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد (۳۲۱۔۴۰۵ھ/۹۳۳۔۱۰۱۴ء)۔ المستدرک علی الصحیحین۔ بیروت۔ لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۱/۱۹۹۰۔

۱۱۔ حسام الدین ہندی، علاء الدین علی متقی (م ۹۷۵ھ)۔ کنز العمال في سنن الأقوال والأفعال۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۳۹۹/۱۹۷۹۔

۱۲۔ زبیدی، ابو الفیض محمد بن محمد بن محمد بن عبد الرزاق مرتضی حسینی حنفی (۱۱۴۵۔۱۲۰۵ھ/ ۱۷۳۲۔۱۷۹۱ء)۔ تاج العروس من جواهر القاموس۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء۔

۱۳۔ زمخشری، امام جاراللہ محمد بن عمر بن محمد خوارزمی (۴۶۷۔۵۳۸ھ)۔ الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل۔ قاھرہ، مصر: ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء۔

۱۴۔ سرخسی، امام شمس الدین (م ۴۸۳ھ)۔ کتاب المبسوط۔ بیروت، لبنان: دارالمعرفہ، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء۔

۱۵۔ ابن سعد، ابو عبد اللہ محمد (۱۶۸۔۲۳۰ھ/۷۸۴۔۸۴۵ء)۔ الطبقات الکبری۔ بیروت، لبنان: دار بیروت للطباعہ والنشر، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء۔

۱۶۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء)۔ تفسیر جلالین۔ بیروت لبنان: دار ابن کثیر، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء۔

۱۷۔ شریف رضی۔ نہج البلاغۃ (خطبات علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہ)۔ کراچی،

پاکستان: محفوظ بک ایجنسی، ۲۰۰۰ء۔

۱۸۔ **شوکانی**، محمد بن علی بن محمد (۱۱۷۳۔۱۲۵۰ھ/۱۷۶۰۔۱۸۳۴ء)۔ فتح القدیر۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء۔

۱۹۔ **طبری**، ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید (۲۲۴۔۳۱۰ھ/۸۳۹۔۹۲۳ء)۔ تاریخ الأمم والملوک۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۷ھ۔

۲۰۔ **قرطبی**، ابوعبد اللہ محمد بن احمد بن محمد بن یحییٰ بن مفرج أموی (۲۸۴۔۳۸۰ھ/۸۹۷۔۹۹۰ء)۔ الجامع لأحکام القرآن۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۲۱۔ **مقدسی**، ابوعبد اللہ بن محمد بن مفلح (۷۱۷۔۷۶۲ھ)۔ الفروع۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۸ھ۔

۲۲۔ **ابن منظور**، محمد بن مکرم بن علی بن احمد بن ابی قاسم بن حبقہ أفریقی (۶۳۰۔۷۱۱ھ/۱۲۳۲۔۱۳۱۱ء)۔ لسان العرب۔ بیروت، لبنان: دار صادر۔

۲۳۔ **نعیم الدین مراد آبادی**، سید (۱۳۰۰۔۱۳۶۷ھ/۱۸۸۲۔۱۹۴۸ء)۔ خزائن العرفان۔ لاہور، پاکستان: قدرت اللہ کمپنی۔

۲۴۔ **ابن ہشام**، ابومحمد عبد الملک ہشام الحمیری (م۲۱۳ھ/۸۲۸ء)۔ السیرۃ النبویۃ۔ بیروت، لبنان: دار ابن کثیر، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۳ء۔

www.MinhajBooks.com